قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ ——— لاہور

بدل اشتراک سالانہ پاکستان -/۴۸ روپے غیر ممالک -/۹۸ روپے	ٹیلیفون :- ۸۸۰۸۰۰ خط و کتابت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) ۲۵-بی گلبرگ ۲ لاہور	قیمت فی پرچہ ۴ چار روپے
جلد ۳۹	جولائی سنہ ۱۹۸۶ء	شمارہ ۷

فہرست

۱۔ لمعات ——— ۲
۲۔ خدا کا خوف (ثریا عذلیب صاحبہ) ——— ۹
۳۔ محترم پرویز صاحب کا ہفتہ واری درسِ قرآن کریم (بذریعہ وی سی آر) ——— ۱۵
۴۔ نظریۂ پاکستان پر کیا گذری (محترم پرویز علیہ الرحمۃ) ——— ۱۷
۵۔ افکارِ پرویز کی صدی (محمد اسلام صاحب) ——— ۴۱
۶۔ پروازِ پرویز (عبداللہ ثانی ایڈووکیٹ) ——— ۵۳
۷۔ حقائق و عبر: (۱) شریعت بل کو واقعی شرعی بنایا جائے (۲) علماء کے ایک دوسرے کے خلاف فتاویٰ ۵۹
(۳) علماء اور ان کی سیاست (۴) قومی اتحاد کے کروڑوں روپے کے فنڈ (۵) شیطان اور تبلیغ (۷) انسان کے خلیفہ ہونے کا تقاضا۔ (۸) حدیث کے نادان محافظ۔

محمد خلیل، ناشر شیخ عبدالمجید۔ مقام اشاعت ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور مطبوعہ اشرف پرنٹنگ پریس ۹۔ ایبک روڈ لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝

لمعات

"ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں"

اواخر اپریل (۱۹۷۸ء) میں ہمارے ہمسایہ ملک، افغانستان میں، جو حادثہ (عسکری انقلاب) رونما ہوا ہے وہ متعدد وجوہات کی بنا پر اپنے اندر بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ہم سرِدست صرف ان اثرات کا جائزہ لیں گے جو (شعوری یا غیر شعوری طور پر) اہلِ پاکستان پر مرتب ہوئے ہیں۔ یہاں ایک عرصہ کے نامساعد حالات کی بنا پر، فضا میں مایوسی عام ہو رہی تھی۔ اس واقعہ سے یوں کہئے جیسے ملک میں غیر محسوس طور پر، خوف و ہراس کی لہر دوڑ گئی ہو۔ مومن اور خوف، دو متضاد عناصر ہیں۔ جماعتِ مومنین کی تو خصوصیت یہ بتائی گئی تھی کہ: فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ۔ (۲/۳۸) ان پر نہ کسی قسم کا خوف طاری ہو سکتا ہے نہ ہراس۔ اس لئے کہ (جیسا کہ ان سے واضح طور پر کہا گیا تھا)۔ انہیں تمام اقوامِ عالم پر غالب رہنا تھا۔ (وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔ ۳/۱۳۸) وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا۔ (۴/۱۴۱) یہ ہو نہیں سکتا کہ خدا، غیر مسلموں کو مومنین پر غالب کر دے۔

لیکن یہ کچھ مومنین کے متعلق کہا گیا تھا۔ ہم مسلمانوں کے متعلق نہیں۔ وہ تو ہم (مسلمانوں) کے ایمان کو ایمان ہی قرار نہیں دیتا، اسی لئے ہمیں ایمان لانے کا حکم دیتا ہے جہاں کہتا ہے کہ: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِىْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ۔ (۴/۱۳۶ و دیگر مقامات) ۔"اے وہ لوگو! جو ایمان کا دعویٰ کرتے ہو اور اپنے آپ کو مومن (یا مسلم) کی حیثیت سے متعارف کراتے ہو۔ تم اللہ۔ اس کے رسول۔ اور اس کتاب پر ایمان لاؤ جو خدا نے اپنے رسول پر نازل کی تھی۔"

سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کونسی بات ہے جس کی وجہ سے، مدعیانِ ایمان سے بھی ایمان لانے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ قرآن کریم نے دوسرے مقام پر ان الفاظ میں بیان کر دی کہ: وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ۔ (۱۲/۱۰۶) ان میں سے اکثر کی یہ حالت ہے کہ

ایمان کے مدعی ہونے کے باوجود مشرک کے مشرک ہی رہتے ہیں۔ یعنی دعویٰ ایمان کے بعد شرک' یہ ہے اس کی حقیقی وجہ۔ ہمارے ہاں شرک سے مراد لی جاتی ہے۔ بت پرستی۔ قبر پرستی۔ پیروں فقیروں کے عرس۔ ان سے مرادیں مانگنا۔ بدعتی رسومات وغیرہ ——— اور بس۔ لیکن قرآن کریم کی رو سے، شرک کا مفہوم ان سے کہیں زیادہ گہرا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ: لَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ أَحَدًا۔ (۱۸/۲۶) "خدا اپنے حق حکومت۔ اپنے احکامات میں کسی کو شریک نہیں کرتا" اس سے واضح ہے کہ احکاماتِ خداوندی کے ساتھ، انسانوں کے خود ساختہ احکام کو ملانا، حقیقی شرک ہے۔ یہ وہ شرک ہے جس کی، دنیا کی تمام مسلمان قومیں عملاً مرتکب ہو رہی ہیں۔ کفر تو یہ ہے کہ سرے سے احکامِ خداوندی سے انکار کر دیا جائے۔ یہ سیکولرازم ہے جس میں جملہ اقوامِ مغرب ماخوذ ہیں۔ لیکن شرک یہ ہے کہ نام حکومتِ الٰہیہ۔ نظامِ خداوندی۔ اقامتِ دین۔ احکامِ خداوندی کا لیا جائے اور عمل انسانوں کے خود ساختہ قوانین پر کیا جائے اور انہیں احکامِ شریعت کہہ کر پکارا جائے۔ ایمان (یا توحید) یہ ہے کہ خالص احکامِ خداوندی کی اطاعت کی جائے۔ اس ایمان کی رو سے فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ لیکن ان میں انسانی احکام و قوانین کی آمیزش کر لی جائے تو اس سے خوف و ہراس کی وہ کیفیت طاری ہو جاتی ہے جس کے متعلق فرمایا کہ: وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَكَأَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَاءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ أَوْ تَهْوِي بِهِ الرِّيحُ فِي مَكَانٍ سَحِيقٍ۔ (۲۲/۳۱) جو خدا سے شرک کرے۔ یعنی احکامِ خداوندی میں غیر خداوندی احکام کی آمیزش کر کے اس کا نام دینِ خداوندی رکھ لے۔ اس کی مثال یوں سمجھئے جیسے کوئی شخص آسمان کی بلندیوں سے زمین کی پستیوں پر آگرے۔ ایسے جیسے کسی پرندے کا نوزائیدہ بچہ اپنے گھونسلے سے نیچے گر جائے اور اسے چیل یا کوّا جھپٹ کر لے جائے۔ یا وہ اس خس و خاشاک کی طرح ہو جائے جسے ہوا کا ہر تیز جھونکا (جھکڑ) جس طرف جی چاہے اڑا کر لے جائے ——— اس شرکِ جلی کی وجہ سے، آج تمام دنیا کی مسلم اقوام کی یہ حالت ہو چکی ہے کہ وہ بے بال و پر پرندوں کے نحیف و نزار بچوں کی طرح ہیں کہ جس ناخن دار پرندے کا جی چاہے انہیں دبوچ لے۔ یا ایسے بے وزن کہ ہر جھکڑ انہیں اڑائے اڑائے پھرے۔ عصرِ حاضر کے جھکڑوں میں، کمیونزم کا جھکڑ سب سے زیادہ تندی اور تیزی کے ساتھ آتا ہے اور ہر خس و خاشاک کو اپنے ساتھ اڑا کر لے جاتا ہے۔ اس جھکڑ کی آمد کے احساس سے ہم پر جو خوف طاری ہو رہا ہے اس کی یہ وجہ ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ جھکڑ آتا کس طرح سے ہے؟ کسی خاص خطۂ زمین پر شدتِ حرارت سے وہاں کی ہوا گرم ہو کر اوپر کو اٹھ جاتی ہے اور اس طرح وہاں خلا پیدا ہو جاتا ہے۔ کارگۂ فطرت میں خلا محال ہوتا ہے۔ اس خلا کو پُر کرنے کے لئے اِدھر اُدھر کی ہوائیں نہایت تندی اور تیزی سے ہجوم کر کے اِدھر آتی ہیں۔ اسے جھکڑ کہتے ہیں۔

آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا کہ کمیونزم کے جھکڑ کو، مسلم ممالک کی فضا کیوں زیادہ راس آتی ہے؟ اس لئے کہ ان ممالک میں جس قسم کا مذہب عام کیا جاتا ہے اس سے دین و دانش دونوں میں خلا واقعہ

ہو جاتا ہے۔ اس خلا کو پُر کرنے کے لئے اس قسم کے جھکڑ ہجوم کر کے آجاتے ہیں۔ اس مذہب کی جگہ اگر دینِ خداوندی متمکن ہو تو اس قسم کے جھکڑ غاروں میں منہ چھپاتے پھریں۔ تاریخ کے اوراق سے پوچھئے کہ جب (اسلام کے صدرِ اوّل میں) دینِ خداوندی متمکن ہوا تھا تو ایران کی مزدکیت (کمیونزم) اور روم کی سرمایہ داری کس طرح لرزاں و ترساں تھی۔

یاد رکھیئے! مغرب کا نظامِ سرمایہ داری ہو یا روس اور چین کی کمیونزم یا اشتراکیت۔ ان کا توڑ صرف قرآن کا نظامِ زندگی ہے۔ آج علامہ اقبالؒ ہم میں موجود نہیں۔ لیکن ان کی قرآنی نگہ بصیرت نے بہت عرصہ پہلے اس خطرہ کو بھانپ لیا تھا اور واضح الفاظ میں بتا دیا تھا کہ ابلیس، نہ مغرب کے جمہوری نظامِ سرمایہ داری سے خائف ہے، نہ روس کی کمیونزم سے۔ وہ خائف ہے دینِ خداوندی سے۔ اس خطرہ کے ازالہ کے لئے اس کی تدبیر یہ ہے کہ مسلمان کو موجودہ مذہب میں اور زیادہ راسخ اور پختہ کر دیا جائے۔ ارمغانِ حجاز میں ان کی بصیرت افروز اور حقائق پرور نظم۔ ابلیس کی مجلسِ شوریٰ ——— یوں تو اس قابل ہے کہ اسے نژادِ نو کے نصابِ تعلیم میں شامل کر دیا جائے۔ لیکن اس وقت ملک میں جو فضا مسلط ہو رہی ہے، اس کے پیشِ نظر اس کا خصوصی مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ اس میں مرض کی تشخیص بھی ہے اور علاج بھی۔ ہم اس کا وہ حصہ، پیشِ خدمتِ قارئین کرتے ہیں جس کا تعلق موجودہ جھکڑ سے ہے۔

ابلیس کی مجلسِ شوریٰ (کابینہ) کا ایک مشیر کہتا ہے کہ ہمارے (ابلیسی) نظام کو تہ و بالا کرنے کے لئے اس سے پہلے جو خطرات اُبھرے ان کا تو ہم نے ازالہ کر دیا۔ لیکن اب جو خطرہ (کمیونزم کی شکل میں) نمودار ہو رہا ہے، اس سے ہم بہت خائف ہیں۔ یہ ہمیں لے ڈوبے گا۔ اس نے کہا: ؎

وہ یہودی فتنہ گر[1] وہ روحِ مزدک[2] کا بروز — ہر قبا ہونے کو ہے اس کے جنوں سے تار تار
زاغِ دشتی ہو رہا ہے ہمسرِ شاہین و چرغ — کتنی سرعت سے بدلتا ہے مزاجِ روزگار!
چھا گئی آشفتہ ہو کر وسعتِ افلاک پر — جس کو نادانی سے ہم سمجھے تھے اک مشتِ غبار
فتنۂ فردا کی ہیبت کا یہ عالم ہے کہ آج — کانپتے ہیں کوہسار و مرغزار و جوئبار

میرے آقا! وہ جہاں زیر و زبر ہونے کو ہے
جس جہاں کا ہے فقط تیری سیادت پر مدار

ابلیس نے اسے نہایت سکوت اور سکون کے ساتھ سنا اور کامل اطمینان و اعتماد کے ساتھ کہا کہ تمہارے یہ خدشات موہوم ہیں۔ یہ کمیونسٹ وقتی طور پر ہنگامے برپا کر سکتے ہیں۔ کوئی ایسا مثبت بالنظام قائم نہیں کر سکتے جو ہمارے تخلیق کردہ نظامِ سرمایہ داری کی جگہ لے سکے۔ سُن رکھو کہ: ؎

دستِ فطرت نے کیا ہے جن گریبانوں کو چاک — مزدکی منطق کی سوزن سے نہیں ہوتے رفو

---

[1] اشتراکیت کا بانی کارل مارکس۔
[2] زمانہ قبل از اسلام میں، ایرانی اشتراکیت کا بانی۔

لہٰذا :

کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد — یہ پریشاں روزگار، آشفتہ مغز، آشفتہ ہُو

تمہاری نگاہ بڑی سطحی ہے۔ ہمارے لئے اشتراکیت خطرہ کا موجب نہیں۔

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس امت سے ہے — جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو

جانتا ہے جس پہ روشن باطنِ ایام ہے

مزدکیت فتنۂ فردا نہیں، اسلام ہے

جب ابلیس نے کہا کہ مجھے کمیونسٹوں سے نہیں بلکہ اُمتِ مسلمہ سے حقیقی خطرہ ہے تو اس کے سطح بین مشیروں کے لب پر خفیف سی ہنسی بکھر گئی۔ اس نے ان کے وساوس کو بھانپا تو کہا کہ تمہارے دل میں جو خیالات گذر رہے ہیں، میں ان سے اچھی طرح باخبر ہوں۔ تم یہی خیال کر رہے ہو ناں، کہ یہ مسلمان جن کا شمار دنیا کی زندہ قوموں میں ہی نہیں، یہ ہمارے لئے کس طرح خطرہ کا موجب ہو سکتے ہیں۔ میں اس حقیقت سے واقف ہوں

جانتا ہوں میں یہ اُمت حاملِ قرآں نہیں — ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں

جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں — بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں

اس اُمت کی بے شک یہی حالت ہے :

عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف — ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبرؐ کہیں

اس وقت تک میں نے شرعِ پیغمبرؐ (یعنی قرآنی نظام) کو بڑے تلبیسانہ انداز سے چھپاتے رکھا ہے۔ دینِ خداوندی کی جگہ میں نے انہیں بے روح مذہبی کھلونے دے رکھے ہیں جن سے یہ اپنا جی بہلاتے رہتے ہیں۔ لیکن مجھے خطرہ ہے کہ زمانے کے تقاضے اس دین کو بے نقاب نہ کر دیں۔ اگر وہ دین بے نقاب ہو گیا تو پھر ہمارا کہیں ٹھکانہ نہیں۔ تمہیں معلوم نہیں کہ وہ دینِ خداوندی۔ وہ آئینِ پیغمبرؐ۔ کس قسم کی تیغِ بے نیام ہے

الحذر آئینِ پیغمبرؐ سے سو بار الحذر — حافظِ ناموسِ زن، مرد آزما، مرد آفریں!

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے — نے کوئی فغفور و خاقاں، نے فقیرِ رہ نشیں

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف — منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب

پادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں

تم خود غور کرو کہ یہ دین کس قسم کا انقلابی نظام لائے گا۔ ایسا نظام جس میں ابلیسی سیاست کے کسی گوشے کو بھی دخل نہیں ہوگا۔ اس میں نہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم ہوگا، نہ محتاج۔ اس میں نہ آمریت ہوگی نہ مغربی جمہوریت۔ نہ سرمایہ داری ہوگی نہ اس کی پشت پناہ مذہبی پیشوائیت۔ اس لئے

۱؎ کمیونزم۔

چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب — یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محرومِ یقیں

اس لئے ہمارے حق میں یہی بہتر ہے کہ یہ اُمت موجودہ مذہب اور تصوف، کی بھول بھلیوں میں اُلجھی رہے اور دینِ خداوندی کی طرف اس کی نگاہ اُٹھے ہی نہیں۔

ہے یہی بہتر الٰہیات میں اُلجھا ہے — یہ کتابُ اللہ کی تاویلات میں اُلجھا رہے
توڑ ڈالیں جس کی تکبیریں طلسمِ شش جہات — ہو نہ روشن اس خدا اندیش کی تاریک رات

یہ سُن کر ابلیس کے مشیروں نے کہا کہ اب ہماری سمجھ میں آگیا ہے کہ ابلیسی نظام کے لئے خطرہ کا گوشہ کونسا ہے۔ یہ تو ہم نے سمجھ لیا۔ اب آپ یہ بتایئے کہ اس خطرہ سے محفوظ رہنے کے لئے ہمیں کیا کرنا چاہیئے! ابلیس نے کہا کہ اس کے لئے کسی لمبے چوڑے پروگرام کی ضرورت نہیں۔ کرنے کا کام فقط یہ ہے کہ مسلمان جس مذہب کو اسلام سمجھے ہوئے ہے، اسے اس میں اور جذب کر دو۔ اسے اس قسم کے مسائل میں اُلجھائے رکھو کہ: ؎

ابنِ مریمؑ مر گیا یا زندۂ جاوید ہے؟ — ہیں صفاتِ ذاتِ حق، حق سے جدا یا عین ذات
آنے والے سے مسیحِ ناصری مقصود ہے — یا مجدّد، جس میں ہوں فرزندِ مریم کے صفات
ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم — امتِ مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات؟

اس نے کہا کہ سوچو: ؎

کیا مسلماں کے لئے کافی نہیں اس دور میں — یہ الٰہیات کے ترشے ہوئے لات و منات؟

تم اسے اس قسم کے نظری مسائل کی بحث و مناظرہ میں اُلجھائے رکھو اور اس کے اس یقین کو اور پختہ کر دو کہ اسلام کی حقیقی خدمت یہی ہے۔ تم اسے ان بے کار مباحث کو زیادہ سے زیادہ مزمن بنا کر دکھاؤ اور اس طرح: ؎

تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے — تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات
خیر اسی میں ہے قیامت تک رہے مومن غلام — چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہانِ بے ثبات
ہے وہی شعر و تصوف اس کے حق میں خوب تر — جو چھپا دے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات

پھر سمجھ لو اور اچھی طرح سمجھ رکھو کہ دنیا کے کسی نظام میں ہمارے لئے خطرہ نہیں۔ خطرہ ہے تو اس سے کہ یہ اُمت کہیں اس نظام قرآنی کو لے کر اُٹھ نہ کھڑی ہو ؎

ہر نفس ڈرتا ہوں اس اُمت کی بیداری سے میں — ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات

اس کے لئے تمہیں یہ کرنا ہوگا ـــــ اور ایسا کرنے میں ہر "مقدس" حربہ استعمال کرنا ہوگا کہ: ؎

مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

تم مسلمان کو باور کرا دو کہ جس مذہب کے تم پرستار ہو یہی مذہب عین اسلام ہے۔ تمہاری تباہی اس مذہب کو چھوڑ دینے سے ہوئی ہے۔ اس کے دوبارہ احیاء میں تمہاری حقیقی خدا پرستی کا راز پوشیدہ ہے۔ پہلے تم اس مذہب کی ترویج انفرادی طور پر کرتے تھے۔ اب تم آزاد ہو اس لئے، اسے قوانینِ مملکت کی حیثیت سے رائج کرو۔ اس سے خدا کی خوشنودی حاصل ہوگی اور تمہاری عاقبت سنور جائے گی۔

یہ تھی "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" کی وہ روئداد جسے حکیم الامتؒ نے، اپنی زندگی کے آخری سانسوں میں مرتب کیا تھا۔ اس روئداد سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ موجودہ مذہب جس قدر زیادہ عام ہوگا، ملت کے نظام میں خلا پیدا ہو جائے گا، جسے پُر کرنے کے لئے سیکولرازم اور کمیونزم جیسے جھکڑ ہجوم کر کے آجائیں گے۔ اس خطرہ سے بچنے کے لئے اقبالؒ نے مملکتِ پاکستان کا تصور دیا تھا تاکہ اس میں قرآنی نظام نافذ کیا جا سکے جو نہ صرف ان جھکڑوں کو اس طرف آنے سے روک بلکہ ساری دنیا کو دکھا سکے کہ شرفِ انسانیت کا راز اسی نظام میں مضمر ہے اور اس کے سوا تمام نظام، خواہ وہ مغربی جمہوریت کا سیکولر نظام ہو۔ خواہ سرمایہ داری یا جاگیرداری کا نظام۔ اور خواہ کمیونزم کا اشتراکی نظام۔ انسانیت کے لئے موت کا سامان اپنے اندر رکھتے ہیں۔ لیکن وائے برحالِ ما، کہ بجائے اس کے کہ یہاں قرآنی نظام نافذ ہو، مروجہ مذہب کی اکاس بیل جڑ پھڑتے سورج کی دھوپ کی طرح پھیلتی چلی گئی جو اس قسم کے مرگ آفریں جھکڑوں کو آوازیں دے دے کر بلاتا ہے۔ یہاں جس قسم کے مذہب کو عام کیا گیا اس کی تفصیل میں جانے کے لئے دور جانے کی ضرورت نہیں۔ طلوع اسلام کے کسی مہینے کے شمارے کے صفحات الٹیے اس کی جھلکیاں آپ کے سامنے آجائیں گی۔

ایک دیرینہ رفیقِ تحریکِ طلوعِ اسلام کی جدائی!

بزمِ طلوعِ اسلام پنج کسی کے بانی مبانی اور نمائندہ، حکیم احمد دین کچھ عرصہ صاحبِ فراش رہنے کے بعد ۱۲ جون ۸۶ء کو ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۝

مرحوم، فاضل طبّ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک معروف عالمِ دین تھے اور حلقۂ ملتان ساہیوال، وہاڑی اور بورے والا میں فکرِ قرآنی کی نشر و اشاعت میں نمایاں خدمات سرانجام دیتے رہے۔ ان کے شاگردوں کی ایک خاصی تعداد ان علاقوں میں پھیلی ہوئی ہے اور خدمتِ قرآن میں کوشاں۔ ادارہ مرحوم کے پس ماندگان کے غم میں برابر کا شریک ہے اور دست بدعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔

ناظم ادارہ

معراجِ انسانیت

سیرتِ صاحبِ قرآن۔ خود قرآن کے آئینے میں
حُسنِ سیرت کی رعنائیاں۔ خالقِ حسن کی نگاہ میں

- سیرتِ طیبہ کے ہر گوشے کا عنوان قرآنی آیات اور اسکی تشریح احادیثِ صحیحہ کی روشنی میں
- ہر واقعہ کی تائید علم و بصیرت اور دلیل و برہان کی رُو سے
- غیر مسلموں کے اعتراضات کا مدلّل اور مسکت جواب
- دنیا بھر کے اربابِ فکر و نظر کا خراجِ تحسین

بارگاہِ رسالت مآبؐ میں

ایک انقلاب انگیز تصنیف، ایک عہد آفریں کوشش۔ عشق و خرد کا حسین امتزاج
بڑا سائز۔ ضخامت پانچسو صفحات۔ کاغذ نہایت اعلیٰ، جلد مضبوط، مزیّن اور مطلّا

قیمت فی جلد -/۹۰ روپے علاوہ محصولِ ڈاک

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور

مکتبہ دین و دانش۔ چوک اُردو بازار لاہور

خدا کا خوف

ہم چونکہ مسلمان کہلاتے ہیں۔ اس لئے اللہ میاں سے ڈرنا ہمارا عقیدہ ہے۔ اس عقیدے پر ایمانِ محکم رکھنے کی صورت یہ ہے کہ ہم اپنی زبانوں سے بار بار یہ کہتے رہیں کہ ہمیں تو ہر وقت خدا کا خوف رہتا ہے اور ہم اپنے رب کے غضب سے بہت ڈرتے ہیں۔ یہ کہہ لیا اور نیچنت ہو گئے۔ عقیدے پر پختگی کا اظہار بھی ہو گیا اور خدا کا خوف کرنے کا فرض بھی پورا ہو گیا۔ اس کے بعد راوی عیش لکھتا ہے۔ خدا کے خوف کا تو ہمیں اتنا خیال رہتا ہے کہ اپنے ساتھ اپنی آئندہ نسل یعنی اپنے بچوں کو بھی نظر انداز نہیں کرتے۔ ذرا انہوں نے بولنے کا آغاز کیا اور ننھے ننھے سوالات کرنے لگے تو ہم اس موقع سے پورا فائدہ اٹھاتے ہیں یعنی ان کے ذہنوں میں اللہ میاں کا ڈر داخل کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ طرح طرح کی عجیب و غریب مثالوں اور قسما قسم کی من گھڑت کہانیوں سے ان کے قلب و ذہن کے گرد اللہ میاں کے ڈر کا ایک جال سا بُن کے رکھ دیتے ہیں۔ پھر ہوتا یہ ہے کہ بچوں کے معصوم ذہنوں میں اللہ کا تصوّر کسی "ہوّا" کا تصوّر بن کر جاگزیں ہو جاتا ہے۔ اس طرح ہم اپنی دانست میں اپنے بچوں کے خیر خواہ بن کر ان کو شروع سے ہی "پکے ایماندار" بنا دیتے ہیں۔ مگر یہ کیسی خیر خواہی ہے۔ غالب کے الفاظ میں ہی کہا جا سکتا ہے۔

ع ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسمان کیوں ہو

جب ہم اپنے بچوں کو ان کے بچپن میں خدا کے صحیح تصوّر سے آشنا کرنے کی بجائے خود ساختہ خوف خدا میں مبتلا کر دیں گے تو پھر آگے چل کر قوم کو وہ باشعور ذی فہم افراد کہاں سے ملیں گے جو خدا کے صحیح تصوّر کے ساتھ خدا کی دی ہوئی زندگی کا حق کسی خوف و خطر کے بغیر ادا کر سکیں۔

بہرحال یہ تو ہم پیدائشی مسلمانوں کا خدا کے خوف کے متعلق اندازِ فکر ہے۔ اب آیئے یہ دیکھیں کہ دراصل خدا کا خوف ہے کیا؟ اور خدا کی کتاب مبین قرآن حکیم میں خدا کے خوف کی کیا وضاحت ملتی ہے۔ اس موقع پر پہلے یہ بات کہنا چاہتی ہوں کہ ہم مسلمانانِ حال کو یہ خوش بختی حاصل ہے کہ ہمارے پاس معلم مشفق مفکرِ قرآن جناب پرویز یعنی بابا جی مرحوم و مغفور کی فکرِ قرآنی اور بصیرتِ فرقانی کے نقوش تابندہ موجود ہیں، جو قرآنی حقائق کو سمجھنے کے لئے نہ صرف دعوتِ غور و فکر دیتے ہیں۔ بلکہ غور و فکر کی راہیں روشن تر کرتے ہیں اور ہمارے سامنے قرآنی الفاظ و اصطلاحات کے وہ معانی و مفاہیم لاتے ہیں۔ جو قرآن چاہتا ہے۔ جو منشائے ایزدی ہے۔ جہاں تک خوفِ خدا کے مفہوم کا تعلق ہے ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم میں خدا کے خوف کا ذکر متعدد مقامات پر آیا ہے اور آیات متعلقہ سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ خوفِ خدا متعلق اس خوف سے قطعاً نہیں جو ایک انسان کو دوسرے انسان سے لاحق ہوتا ہے۔ یعنی اس انسان سے جس

کی طرف سے اسے کسی نقصان کا اندیشہ ہو۔ یا ان لوگوں سے انسان کو خوف پیدا ہوتا ہے جنہیں وہ صاحب اقتدار اختیار سمجھتا ہے اور ان سے امیدیں وابستہ رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ خوف کسی آنے والے خطرہ یا کسی غلط کام کے نقصان رساں نتیجہ کے احساس کا بھی نام ہے۔ مثلاً یہ ڈر کہ اگر میں نے آگ میں ہاتھ ڈال دیا تو اس سے میرا ہاتھ جل جائے گا اور اس سے بڑی اذیت ہوگی۔ اس لئے مجھے آگ سے بچنا چاہیئے۔ خوف کی یہ صورت انسان کو غلط روی کے انجام سے باخبر رکھتی ہے اور وہ برے کاموں سے محتاط رہتا ہے۔ اس خوف کے معنی ہونگے کہ کسی آنے والے خطرہ کے احساس سے ان اسباب کا سدباب کرنا جن سے اس خطرہ کے پیدا ہونے کا امکان ہو۔ قرآن کریم میں مومنین کے متعلق کہا گیا ہے۔ يُوفُونَ بِالنَّذْرِ وَيَخَافُونَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهُ مُسْتَطِيرًا۔ یعنی وہ جو اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرتے ہیں کیونکہ انہیں اس کا خوف رہتا ہے کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو معاشرہ ایسی شکل اختیار کرے گا جس میں چاروں طرف شر پھیل جائے گا۔ اس فرمانِ خداوندی سے خدا کے خوف کا مفہوم واضح ہے اور وہ یہ کہ قوانینِ خداوندی کے خلاف ورزی کے تباہ کن انجام کا احساس کرتے ہوئے اس خلاف ورزی سے محتاط رہنے کا جذبہ۔ یہ وہ خوف نہیں جو کسی ظالم و جابر حاکم کی دھاندلی اور تشدد کے احساس سے پیدا ہوتا ہے بلکہ اس خوف خداوندی کے معنی یہ ہیں کہ اس احساس سے کہ قوانینِ خداوندی کو چھوڑ دینے سے میرا کس قدر نقصان ہوگا۔ ان قوانین کا پورے جھکاؤ کے ساتھ اتباع کرنا (یہ نہیں کہ قوانین خداوندی کا اتباع تو کریں نہیں۔ بس خوف خدا کا اظہار توبہ توبہ کہتے ہوئے کانوں کو ہاتھ لگا کر کر دیا جائے) سورۃ نحل میں اشیائے کائنات اور ملائکہ کی مثال دے کر بتایا گیا ہے کہ خدا کا خوف رکھنے والے غلط روش کے تباہ کن نتائج کا احساس کر کے اس سے مجتنب رہتے ہیں۔ فرمانِ ربی ہے۔ يَخَافُونَ رَبَّهُم مِّن فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ (۱۶/۵۰) یہ اپنے نشوونما دینے والے کے غلبہ و اقتدار سے ڈرتے ہیں۔ اور جو کچھ حکم دیا جاتا ہے وہی کرتے ہیں۔ یعنی وہ قوانین خداوندی کی پوری پوری اطاعت کرتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اس کی خلاف ورزی کا نتیجہ فساد ہوگا۔ سورۃ النّٰزعٰت میں ہے (۷۹/۴۰) وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَىٰ جو شخص مقام خداوندی سے ڈرتا ہے اور اپنے آپ کو پست جذبات سے باز رکھتا ہے۔ اس سے خوف کے مفہوم کی وضاحت ہو رہی ہے۔ یعنی اپنے پست جذبات کے پیچھے چلنے سے جو نقصان ہوتا ہے اسی کا احساس کرتے ہوئے ایسا کرنے سے باز رہنا۔ ایسے جذبات سے بچنا۔ اس خوف کی اہمیت تو اس درجہ ہے کہ عام انسان تو کیا خود حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے یہ کہلوایا گیا کہ قُلْ إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ (۶/۱۵) یعنی خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل اس قدر ہمہ گیر ہے کہ (اور تو اور) اگر (بفرضِ محال) اگر میں بھی اس کی خلاف ورزی کروں تو ڈرتا ہوں کہ میں بھی اس کے تکلیف دہ اور مضر نتیجہ سے بچ نہیں سکوں گا۔"

قرآن کریم بتاتا ہے کہ اس خوف یا احساس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جماعت مومنین خدا کے قوانین کی خلاف ورزی اور اس کے احکام کی نافرمانی سے اپنے آپ کو بچا کر رکھے گی اور محتاط رہے گی۔ یہ احتیاط اسے ہر قسم کے دنیاوی خوف سے محفوظ کر دے گی۔ اسی احساس کو قرآن نے تقویٰ سے تعبیر کیا ہے اور کہا ہے۔

فَمَنِ اتَّقٰی وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝ جو احتیاط برتنے کا انقویٰ اختیار کرے گا اور اس طرح اپنی اصلاح کرلے گا تو اسے کسی قسم کا خوف و حزن نہیں ہوگا۔

اللہ سے ڈرنا ہمارا عقیدہ تو ہے لیکن اس کی بھی بعینہ وہی کیفیت ہے جو ہمارے دوسرے "منہ زبانی" عقائد کی ہے' وہ جن کا عمل سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ اللہ سے ڈرنا یا خدا کا خوف تو یہ ہے کہ قانون مکافات عمل پر ہمارا ایمان یقین محکم ہو۔ ہر کام کرتے وقت اس کا یقین ہو کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں۔ ویسا ہی نتیجہ ساتھ کے ساتھ مرتب ہو رہا ہے۔ جو اپنے وقت پر سامنے آئے گا۔ یہ احساس ہمیں ہر قدم پر غلطی کرنے سے روکے گا۔ غلط روی سے بچائے گا۔ خدا کے خوف کا مفہوم تو یہ ہے کہ ہمہ وقت اس امر کو پیش نظر رکھا جائے کہ ہم اپنے اعمال کے لئے خدا کے سامنے جواب دہ ہیں۔ حقیقی معنوں میں اللہ سے ڈرنے والے وہ لوگ ہوتے ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ ارشاد خداوندی کے مطابق قانون مکافات کی رُو سے ہر شخص کو اپنے اعمال کا خمیازہ خود بھگتنا پڑتا ہے یَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَهٗ ۔ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا یَّرَهٗ : غلط اور صحیح اعمال کا ایک ایک ذرہ سامنے آجائے گا۔ ان آیات کی موجودگی میں بھی اگر یہ سمجھ لیا جائے۔ جیسا کہ ہم نے من حیث القوم سمجھ رکھا ہے کہ ہم جو چاہیں کریں۔ ہمیں دیکھنے پوچھنے والا کوئی نہیں تو یہ یکسر فریب خوردگی ہے۔ دیکھئے قرآن کیا اعلان کر رہا ہے اَیَحْسَبُ اَنْ لَّمْ یَرَهٗ اَحَدٌ " :- کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ اسے کوئی دیکھ ہی نہیں رہا یعنی وہ جو چاہے کرتا چلا جائے۔ جائز و ناجائز کی کوئی تفریق نہ رکھے تو اس پر کوئی اس کا ہاتھ روکنے والا نہیں۔ سُن لو! کہ اس کی یہ سوچ قطعی غلط اور گمراہ کن ہے جس وقت وہ سمجھتا ہے کہ وہ بالکل تنہا ہے کوئی دوسرا اس کے پاس نہیں اس وقت بھی وہ تنہا نہیں ہوتا کیونکہ ہر جگہ اور ہر وقت اس کے ساتھ ہوتے یا رہنے والا خود خدا ہے۔ وَهُوَ مَعَكُمْ اَیْنَ مَا كُنْتُمْ ۔ وہ تمہارے ساتھ ہوتا ہے جہاں کہیں بھی تم ہو وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ۝ اور جو کچھ بھی تم کرتے ہو وہ اسے دیکھ رہا ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ہمیں اس بات کا پختہ یقین ہو کہ ہم جو کچھ بھی کریں خدا اسے دیکھتا ہے تو ہم سے کبھی دانستہ طور پر قانون شکنی یا بدعملی کا ارتکاب نہ ہو۔ جرم یا گناہ بالعموم اسی مفروضہ کے تحت ہی کیا جاتا ہے کہ مجھے کوئی نہیں دیکھتا۔ اسی کا دوسرا نام خدا کے خوف سے بیگانہ ہونا ہے۔ اس کے مقابل خدا کے خوف کی صحیح شکل یہ ہے کہ قرآن کا یہ اٹل فرمان اِنَّ اللّٰهَ بِمَا یَعْمَلُوْنَ مُحِیْطٌ ۝ (خدا انسان کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے) ہمارے ذہنوں اور ہمارے قلوب میں ہر دم جاگزیں ہو۔ یہ ہمہ وقتی احساس کوئی خطا سرزد نہیں ہونے دیتا۔ خدا تو وہ ہے جو صرف ہمارے عمل کے وقت ہی ہمیں نہیں دیکھتا۔ وہ تو ہمارے دل میں گزرنے والے خیالات تک کا علم رکھتا ہے۔ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۚ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ ۔ یعنی ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے اور اس کے دل میں گزرنے والے خیالات تک سے واقف ہیں۔ اس لئے کہ ہم اس کی رگ جاں سے بھی زیادہ قریب ہوتے ہیں۔

قرآنی آیات کی روشنی میں خدا کے خوف کا مفہوم سمجھ لینے کے بعد یہ سمجھنا مشکل نہیں رہتا کہ خدا کا خوف رکھنے والوں کا شعار زندگی کیا ہوتا ہے اور وہ کیا کردار انجام دیتے ہیں۔ سورۃ الانبیاء میں آیا ہے کہ اللہ سے ڈرنے والے متقین ہوتے ہیں۔ متقین یعنی اہل تقویٰ اور تقویٰ قرآن کریم کا وہ جامع لفظ ہے جو مومنین کی ان تمام صفات و خصوصیات کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ جن کا ذکر قرآن کریم کے ورق ورق پر ہمیں نظر آتا ہے اور ان اللہ سے ڈرنے والوں میں مومن مرد و عورتیں دونوں شامل ہیں۔ یہ ہیں ثبات و استقامت کے پیکر خود استقامت رکھتے ہوئے دوسروں میں استقامت پیدا کرنے والے۔ اپنے دعوئ ایمان کو عمل سے سچ کر دکھانے والے اپنی توانائیوں اور صلاحیتوں کو قوانین خداوندی کے مطابق صرف کرنے والے۔ انفاق کے راستے میں اپنی دولت اور سامان زیست کو ضرورت مندوں کے لئے کھلا رکھنے والے۔ انصاف قائم کرنے والے جھوٹ اور فریب کی شہادت نہ دینے والے۔ ناپ تول میں پورے اترنے والے کارگہ کائنات میں غور و فکر کرنے والے۔ حق و صداقت کی راہ میں مسلسل جد و جہد کرنے والے۔ حق کی حمایت میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈرنے والے۔ قوانین خداوندی کی محکمیت پر پورا پورا بھروسہ رکھنے والے۔ نظام صلوٰۃ قائم کرنے والے۔ صلوٰۃ کی حفاظت کرنے والے۔ جہاں سے غلط قدم اٹھ جاتے وہیں واپس آکر صحیح راستے پر چلنے والے۔ خدا کے ساتھ جو عہد کیا ہے اسے پورا کرنے والے۔ برائی کو بھلائی سے دور کرنے والے۔ قوانین و احکام خداوندی کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہوئے ان کی پوری پوری اطاعت کرنے والے عصمت کی حفاظت کرنے والے۔ معاہدات و امانت کی حفاظت کرنے والے۔ جو کچھ اپنے اوپر واجب قرار دے لیا ہو اسے پورا کرنے والے۔ ایک دوسرے کی غیبت سے بچنے والے۔ لوگوں کے ساتھ بے رخی نہ کرنے والے۔ آپس میں حسن ظن سے کام لینے والے۔ صاف سیدھی اور دوٹوک بات کرنے والے لوگوں سے درگزر کرنے والے۔ اچھے کاموں میں سبقت لے جانے والے۔ دوسروں کی ضرورت کو اپنے اوپر ترجیح دینے والے۔ کبائر الاثم اور فواحش سے بچنے والے۔ دنیا کی ہر شے اور ہر رشتے کے مقابلے میں ایمان اور جہاد کو عزیز رکھنے والے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشادات کے مطابق یہ سب وہ لوگ ہیں جن کا شمار خدا کا خوف کرنے والے بندوں میں ہوتا ہے۔ جو حدود اللہ یعنی قوانین خداوندی کی چاردیواری کے اندر رہتے ہوئے زندگی بسر کرتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں انعام ربانی کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔ فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ ان کا اجر ان کے رب کے ہاں سے ملے گا۔ اور وہ اجر یہ ہوگا کہ انہیں نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حزن۔ پھر ارشاد ہوتا ہے۔ بَلَىٰ مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ عِندَ رَبِّهِ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ جس نے بھی قوانین خداوندی کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔ اور پھر قرآنی معیار کے مطابق حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کی۔ تو خدا کے قانون مکافات کی رو سے اسے اس کا اجر مل جائے گا۔ ایسے لوگوں کو کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حزن۔

ان آیات خداوندی سے واضح ہے کہ ہدایت خداوندی کی پیروی کرنے سے خوف اور حزن دونوں سے امن ملتا ہے۔ یہاں خوف و حزن کی جو دو کیفیتیں بتائی گئی ہیں یہ وہ ہیں جو انسانی معاشرہ کی ناہمواریوں

کی پیداوار ہوتی ہیں۔ یہ خوف و حزن محکومی و غلامی، نکبت و زبوں حالی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ خوف انسانوں کو انسانوں سے لاحق ہوتا ہے جس کی وجہ سے نفسیاتی الجھنیں اور اعصابی عوارض جنم لیتے ہیں۔ جن سے انسانی ذات کی نشوونما رک جاتی ہے۔ یہ خوف اور حزن جرأت و پامردی، حق گوئی اور بے باکی کے اوصاف چھین لیتا ہے۔ اسی لئے اسے خدا کا عذاب قرار دیا گیا ہے۔ اسی خوف و حزن کے شکار مغلوب و محکوم افراد ہوتے ہیں۔ جبکہ مومن کی زندگی مغلوب و محکوم کی نہیں۔ غالب اور بالادست کی زندگی ہے۔ جس کے متعلق قرآن یہ فیصلہ دیتا ہے کہ لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْأَكْبَرُ (۲۱/۱۰۳) بڑے سے بڑا حادثہ بھی ان کے دل میں پریشانی و افسردگی پیدا نہیں کر سکتا۔ مومنین نہایت استقامت سے اس کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اور اس پر غالب آجانے کے بعد یہ کہتے ہوئے بحضورِ ربّ العزت سجدہ شکر بجا لاتے ہیں۔ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ (اور پکار اٹھتے ہیں کہ کسقدر لائق حمد و ستائش ہے یہ نظام جس نے ہماری تمام پریشانیوں اور افسردگیوں کو دور کر دیا)۔ مومن کا تو مادہ ہی امن ہے۔ جس کا خوف سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ چنانچہ مومنین کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دوست ہونے کا مقام بلند عطا کیا ہے جیسا کہ سورۂ یونس میں ارشاد ہوتا ہے۔ أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللَّهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ ۝ یاد رکھو! جو لوگ قوانینِ خداوندی کی اطاعت سے نظامِ خداوندی کے قیام کے لئے اللہ کے رفیق (اور عباد اللہ) بن جاتے ہیں۔ انہیں نہ کسی خارجی قوت کا خوف رہتا ہے نہ داخلی کشمکش سے اندوہناکی۔ (مگر یہ بھی جان رکھو) کہ اولیاء اللہ کا کوئی الگ گروہ نہیں ہوتا۔ یہ وہی لوگ ہیں۔ جو قوانین کی صداقت پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور ان کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں۔ یعنی مومنین اور متقین ہی اولیاء اللہ یعنی اللہ کے رفیق اور دوست ہوتے ہیں۔ مومن ہونے کا دعویٰ تو بڑے شد و مد سے ہمیں بھی ہے۔ لیکن کیا ہم نے کبھی یہ سنجیدگی سے سوچا یا یہ جاننے کی زحمت کی کہ کیا ہمارا ایمان قرآنی معیار پر پورا اترتا ہے۔ یعنی وہ ایمان کہ جس کے نتیجے میں کسی قسم کا خوف و حزن پاس نہیں پھٹکنے پاتا انفرادی طور پر بھی اور اجتماعی حیثیت سے بھی! مگر ایسا کب ہے! یہاں تو ہر شخص دوسرے شخص سے خوفزدہ ہے۔ کہیں یہ مجھے دھوکا نہ دے رہا ہو۔ میں اس کے ہاتھوں بے خبری سے نہ مارا جاؤں۔ دوستی کے پردے میں دشمنی نہ کر رہا ہو وغیرہ وغیرہ۔ جب معاشرے میں خدا کا خوف عملی طور پر باقی نہیں رہتا تو انسان کا انسان سے لرزاں و ترساں رہنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اس صورتِ حال میں معاشرے میں جو گراوٹیں اور خرابیاں پیدا ہوتی ہیں ان کے ثبوت کے لئے کہیں دُور جانے یا ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں۔ اپنا معاشرہ اس کی منہ بولتی تصویر ہے۔ جبکہ جماعت مومنین کی ذمہ داری وہ قرآنی معاشرہ متشکل کرنا تھی۔ ہے۔ اور رہے گی۔ جس کے افراد خوف و حزن سے مامون و محفوظ رہتے ہیں۔ زندگی کی انتہائی کامیابی یہ ہے کہ معاشرہ میں ایسے حالات پیدا نہ ہونے دیئے جائیں جن سے انسان پر خوف و حزن طاری رہے اور اس سے بڑھ کر جنت کیا ہو سکتی ہے کہ کسی کو کسی قسم کا خوف اور دل گرفتگی نہ ہو۔ جہاں ایک خدا کا خوف دنیا کے تمام ناخداؤں کے خوف سے بے خوف کر دے۔ اگر ہم سمجھنا چاہیں

تو خدا کے خوف کا مفہوم مبہم ہے نہ پیچیدہ۔ سیدھی اور صاف بات اتنی ہے کہ خدا کا خوف خدا کے کلام سے عملاً وابستگی کا نام ہے۔ یہ وہ خوف ہے جو تمام دنیاوی خوفوں کی جڑ کاٹ دیتا ہے۔ اقبال علیہ الرحمہ نے کہا تھا۔ ؎

برخور از قرآں اگر خواہی ثبات — در خمیرش دیدہ ام آب حیات
مے دہد مارا پیام لا تخف — مے رساند بر مقام لا تخف

اگر تم ثبات چاہتے ہو تو قرآن کی حکمرانی قائم کرو۔ اسی میں رازِ دوام حیات پوشیدہ ہے۔ اسی سے تم اس مقام پر پہنچ سکتے ہو۔ جہاں نہ کسی کا خوف ہوگا نہ حزن۔ یہی مومن کا مقام ہے اس زندگی میں اور آنے والی زندگی میں بھی۔

وَمَا تَوْفِيقِيْ إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ

راقمہ
ثریا عندلیب

محترم پرویز صاحب کا ہفتہ وار درس قرآن کریم

محترم پرویز صاحب کے اس درس نے عالمگیر شہرت حاصل کر لی ہے۔ مرکزی درسگاہ تو ادارۂ طلوع اسلام (B/25 گلبرگ ۲) ہے جہاں یہ درس (آج کل) ہر جمعہ کی صبح ۸ بجے بذریعہ وی سی آر (V.C.R) ہوتا ہے لیکن اندرون پاکستان اور بیرونی ممالک میں اسے ٹیپس (TAPES) کے ذریعے عام کیا جاتا ہے۔ حسب ذیل مقامات پر یہ (V-C-R) کے ذریعے نشر ہوتا ہے:۔

کراچی:۔ ہر جمعہ ۹½ بجے صبح کتب خانہ بزم طلوع اسلام کمرہ نمبر ۲۴ ہارون چیمبرز الطاف حسین روڈ نیو چالی فون نمبر:۔ ۲۳۸۸۲۸

اوسلو:۔ (ناروے) ہر اتوار شام ۵ بجے بمقام:۔
JINNAH HALL, KEYSERS GATE-I
OSLO—I
زیر انتظام محترم امجد محمود صاحب ٹیلیفون نمبر 02-615756

لندن:۔ (یو کے) ہر ماہ کے آخری اتوار دو بجے بعد دوپہر بمقام
47 HURLE ROAD
GREEN FORD MIDDLE SEX
TEL: 01—578—5631

ٹورنٹو:۔ (کینیڈا) ہر ماہ کا پہلا اتوار ۱۰ بجے صبح
335 DRIFTWOOD-AVE:#311,
DOWNS VIEW, TORONTO (ONT:)
M3N—2P3, TEL:(416) 661—2827

پشاور:۔ ہر جمعہ صبح ۱۰½ بذریعہ (VCR) رہائش: شیر افضل خان نمائندہ بزم بالمقابل رحمان برادرز ٹمبر کارپوریشن یونیورسٹی روڈ تہکال پایاں پشاور

بٹ آئرن:۔ ہر ماہ کا آخری جمعہ بعد نماز جمعہ یوسف بٹ صاحب بٹ آئرن سٹور چک جمال روڈ کالا گوجراں جہلم

لاہور:۔ ہر جمعہ ۸ بجے صبح۔ ۲۵-بی گلبرگ ۲ نزد پولیس اسٹیشن فون نمبر:۔ ۸۸۰۸۰۰
(بذریعہ وی سی آر (V-C-R)

گوجرانوالہ:۔ ہر ماہ کا پہلا جمعہ بعد نماز جمعہ درس قرآن کریم بذریعہ وی سی آر ہر ماہ کے بقیہ جمعہ بعد نماز جمعہ حسب معمول کیسٹ پر

گجرات:۔ ہر جمعرات تین بجے سہ پہر رہائش گاہ:۔ ڈاکٹر محمد اکرم مرزا صاحب جنرل کالونی (گجرات) ٹیلیفون نمبر:۔ ۳۶۳۰ + ۳۷۴۰

فریڈرکستاد:۔ (ناروے) ہر ماہ کا پہلا اور تیسرا اتوار شام ۴ بجے بمقام
ARNE-SVENDSENS-GATE-1, 1600
FREDRIKSTAD, NORWAY
TEL:(032) 10287 / 22802

برمنگھم:۔ (انگلینڈ) ہر ماہ کا پہلا اتوار ۲ بجے بعد دوپہر
227/229 ALUM ROCK ROAD 38-
3 BH (BIRMING HAM)

ملتان:۔ جمعہ ۱۰ بجے صبح دفتر میسرز شاہ سنز بیرون پاک گیٹ (فون نمبر:۔ ۳۱۰۷۱)

لندن یو کے:۔ ہر ماہ کے دوسرے اتوار 39 MANSELL RD GREENFORD MIDDLE SEX TEL 01-575-5862

اور ذیل کے مقامات پر، عام (TAPES) کے ذریعے

نام بزم طلوع اسلام	دن اور وقت	مقام اور درس کے کوائف
لندن (انگلینڈ)	ہر ماہ کا پہلا اتوار ۲½ بجے بعد دوپہر	76, PARK ROAD, ILFORD, TELPHONE No, 553 — 1896
کوئٹہ	باقاعدہ ہفتہ وار	رابطہ کے لئے :۔ صابر ہومیو فارمیسی توغی روڈ باہتمام غلام صابر صاحب
فیصل آباد	جمعہ ۳½ بجے سہ پہر	حیات سرجری کلینک ۱ ے/ ۲۳ پیپلز کالونی ۱ (فون نمبر :۔ ۴۲۸۵۵)
ہنگو	جمعہ ۵½ بجے شام	رہائش گاہ محمد جمیل صاحب واقع ریلوے روڈ (فون نمبر ۶۷)
راولپنڈی	ہر جمعہ ۵ بجے شام	جی۔ ۱۶۶ لیاقت روڈ
پنجکسی تحصیل کبیر والا (ملتان)	جمعہ ۳ بجے سہ پہر	مطب حکیم احمدالدین صاحب (نمائندہ بزم
گجرات	جمعہ بعد نماز جمعہ اور اتوار ۴ بجے سہ پہر	۱۲۰/۷ بی بھمبر روڈ باہتمام شیخ قدرت اللہ صاحب ایڈووکیٹ
جلال پور جٹاں	جمعہ بعد نماز جمعہ	دفتر بزمِ طلوعِ اسلام (بازار کلاں)
ایبٹ آباد	۱۔ جمعہ ۴ بجے سہ پہر ۲۔ اتوار ۴ بجے سہ پہر	رہائش گاہ: صلاح الدین صاحب واقع 234-K-L کہیال (ایبٹ آباد) رہائش گاہ: غلام مصطفےٰ اعوان صاحب K-356 گنج گراؤنڈ (ایبٹ آباد)
بورے والا	ہر ماہ کا پہلا اور تیسرا جمعہ بعد نماز جمعہ	بر مکان محمد اسلم صابر مرضی پورہ گلی نمبر ۵ نیسرا چوک ملتان روڈ۔ بورے والا
سرگودھا	ہر جمعہ صبح ۹ بجے	رہائش گاہ :۔ ارشد محمود ارشد 60/A سول لائن ریلوے روڈ سرگودھا (جو مابین جناح سینما اور شمع سینما بین ریلوے روڈ پر واقع ہے (فون ۴۷۱۶)

باسمہٖ تعالیٰ

سلسلۂ قرآنی نظام

نظریۂ پاکستان پر کیا گذری؟

(۱۹۷۲ء کا خطاب، ــــ عنوان اور الفاظ کے ادنیٰ تغیّر کے ساتھ)

پرویزؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظریۂ پاکستان پر کیا گزری؟

دسمبر ۱۹۷۱ء میں جب سقوطِ ڈھاکہ کا جانگداز المیہ پیش آیا تو پرویز صاحب پر اس کا اس قدر شدید اثر ہوا کہ احباب ان کی صحت کے متعلق بے حد متفکر ہو گئے۔ پرویز صاحب اس قسم کے صدمات پر بڑے ضبط سے کام لیا کرتے ہیں لیکن اس موقعہ پر یہ ضبط انہیں اندر ہی اندر گھلائے چلا جا رہا تھا۔ ہم چاہتے تھے کہ کوئی موقع ایسا مل جائے کہ وہ اپنے اس سوزِ نہاں کو لب پر لے آئیں تاکہ اس آتشِ خاموش کی حدت میں کچھ تو کمی ہو۔ یہ موقع اگست ۱۹۷۲ء میں "یومِ آزادی" کی تقریب نے مہیا کر دیا۔ اس تقریب پر انہوں نے اپنے خطاب کا جو عنوان تجویز کیا وہ ان کے سینے میں برپا ہونے والے طوفان کا غماز تھا۔ عنوان تھا ——— قائدِ اعظمؒ! آپ کہاں ہیں؟ ——— وہ جب اپنے اس خطاب کو ضبطِ تحریر میں لا رہے تھے تو ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کے چشمے رواں تھے۔ اور جب انہوں نے اسے مجمع میں پیش کیا تو وہ سسکیاں بھر رہے تھے اور سارا ہال بلک بلک کر رو رہا تھا۔ ان کے موضوع کا نقطۂ ماسکہ یہ تھا کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ وہاں قائدِ اعظمؒ کے خلاف نفرت پھیلائی گئی اور نظریۂ پاکستان کا مذاق اڑایا گیا، اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ قصرِ پاکستان کی بنیادوں میں تزلزل آ گیا۔ انہوں نے اپنے خطاب میں نہایت وضاحت سے بتایا کہ قائدِ اعظمؒ کی عظمت کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے کس طرح مطالبۂ پاکستان کی بنیاد، قرآنِ کریم پر رکھی۔ اور مطالبۂ پاکستان کی جس قدر مخالفت ہوئی وہ محض اس بنا پر تھی کہ، اس خطۂ ارض میں قرآنی نظام قائم نہ ہونے پائے۔ پرویز صاحب کے اس خطاب نے ملک کے طول و عرض میں نمایاں اثر کیا۔

اب جو ملک گذشتہ کئی ماہ سے انتشار اور خلفشار کا شکار ہو رہا ہے تو اس میں اس قسم کی آوازیں بھی ابھرنی شروع ہو گئی ہیں جن سے علامہ اقبالؒ کی عظمت اور قائدِ اعظمؒ کا احترام دلوں سے مٹتا جائے۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر خطرہ پیدا ہو رہا ہے کہ (خدانخواستہ) یہاں بھی (سابق) مشرقی پاکستان کے سے حالات نہ پیدا ہو جائیں۔ اس احساس سے متاثر ہونے والے حضرات کا تقاضا ہے کہ پرویز صاحب کا مذکورہ بالا خطاب دوبارہ شائع کیا جائے۔ چنانچہ اسے (ضروری حک و اضافہ کے ساتھ) پیشِ خدمت قارئین کیا جاتا ہے۔

خطاب

کچھ نقش تری یاد کے باقی ہیں ابھی تک
دل بے سروساماں سہی ویراں تو نہیں ہے

صدرِ محترم و عزیزانِ گرامی قدر!　　سلام و رحمت۔

ہماری ملّی زندگی میں آج کے دن سے زیادہ عزیز اور عظیم دن کوئی نہیں کہ اس دن ہم نے انگریز اور ہندو کی غلامی سے نجات حاصل کر کے اپنی آزاد مملکت کا افتتاح کیا تھا۔ ماسوائے سالِ گذشتہ (۱۹۷۱ء) کہ ہمارا سیاسی مطلع گرد آلود تھا ہم اس تقریب کو بطور جشنِ مسرت مناتے رہے لیکن اس سال (۱۹۷۲ء) جو میں آپ کے سامنے حاضر ہو رہا ہوں تو جذبات کی ایک عجیب دنیا دل میں لئے ہوئے۔ اسے کچھ ایسے سمجھئے جیسے کوئی بوڑھا باپ، اپنے اُن جواں سال جڑواں بیٹوں کی سالگرہ منا رہا ہو جن میں سے ایک کو وہ سپردِ خاک کر چکا ہو اور دوسرے کی تیمارداری میں مصروف۔ پچھلے سال اس سوختہ بخت ملک اور حرماں نصیب قوم پر جو کچھ بیتی، اور آج جن تذبذب آمیز حالات سے ہم گزر رہے ہیں، اس کے احساس سے دل کا خون خود بخود کھنچ کر آنکھ میں آجاتا ہے۔ اور یہ تنہا ــــ مرا رونا نہیں، رونا ہے یہ سارے گلستاں کا ــــ لیکن یہ ظاہر ہے کہ کسی کے ساتھ تعلقات جس قدر گہرے ہوں، اور ان کی مدت جتنی طویل، اسی نسبت سے اس کی بربادی کا غم شدید اور اس کی تباہی کا صدمہ عمیق ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے میں کہہ سکتا ہوں کہ آج پاکستان میں بہت کم حضرات ایسے ہوں گے جن کا سینہ مجھ ایسا فگار اور جن کا قلبِ حزیں اس قدر، برنگِ غنچۂ لبریز جراحت ہو۔ میری کیفیت یہ ہے کہ:

خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغِ مردہ ہوں میں بے زباں گورِ غریباں کا!

پاکستان کے ساتھ میرے تعلقات کی گہرائی کا اندازہ اس سے لگایئے کہ اس کا حصول میرے لئے تقاضائے دین تھا اور اس خطۂ پاک کا تحفظ میرا جزوِ ایمان ہے۔ باقی رہی ان تعلقات کی مدّت، تو اس کے متعلق اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ:

تو اپنی بزمِ ناز کو دیکھ اور ازل کو دیکھ　　آیا کہاں سے تیری تمنّا لئے ہوئے

۱۹۳۰ء کا پاکستانی

میں اس زمانے کا پاکستانی ہوں جب ہنوز پاکستان کا نام بھی کسی نے نہیں سنا تھا۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ میں جنگِ بلقان کے زمانے سے کہ میری عمر بمشکل، آٹھ نو سال کی ہوگی، ملّتِ اسلامیہ کی سیاست سے دلچسپی لینے لگ گیا تھا۔ (میری تعلیم و تربیت ہی اس انداز سے ہوئی تھی) اس کے بعد، خود ہندوستان میں متعدد تحریکیں آندھیوں کی طرح اٹھیں اور آنسوؤں کی طرح بیٹھ گئیں لیکن ان میں سے کوئی بھی میرے لئے وجہِ گلہائے تسلّی نہ ہوئی تا آنکہ آج سے بیالیس سال پہلے ۱۹۳۰ء میں، علامہ اقبال علیہ الرحمۃ نے الٰہ آباد کے مقام پر، اپنے مشہور خطبۂ صدارت میں اس منزل کی نشاندہی کر دی جو میرے لئے قبلۂ مقصود اور کعبۂ مدعا بن گئی۔ انہوں نے فرمایا تھا:

ہندوستان دنیا بھر میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے۔ اس ملک میں اسلام بہ حیثیت ایک تمدنی قوت کے اسی صورت میں زندہ

رہ سکتا ہے کہ اسے ایک علاقہ میں مرکوز کر دیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام، خدا اور بندے کے درمیان ایک روحانی تعلق کا نام نہیں۔ یہ ایک نظامِ حکومت ہے۔ اس نظام کا تعین اس وقت ہو چکا تھا جب کسی روسو کے دل میں ایسے نظام کا خیال تک نہیں آیا تھا..... اس کی صحیح قدر و قیمت اس وقت معلوم ہوتی ہے جب وہ ایک معاشرتی نظام کی مشینری میں اپنی جگہ فٹ ہو (اور یہ چیز اپنی آزاد مملکت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی) اس لئے میری آرزو یہ ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد اسلامی ریاست قائم کر دی جائے۔..... اس سے اسلام اپنی تعلیم اور ثقافت کو پھر سے زندگی اور قوت عطا کر سکے گا اور انہیں عصرِ حاضر کی روح کے قریب تر لانے کے قابل بنا سکے گا۔

اس سے یہ حقیقت سامنے آئی کہ اسلام، مذہب نہیں، دین یعنی نظامِ حیات ہے، اور یہ نظامِ حیات اسی صورت میں زندہ اور قائم ہو سکتا ہے جب مسلمانوں کی اپنی آزاد مملکت ہو۔ اس سے، اپنی آزاد مملکت کا حصول میرے لئے تقاضائے دین بن گیا۔

۱۹۳۷ء میں جب قائدِ اعظمؒ، علامہ اقبالؒ کے اس تصورِ اسلام کو عملی پیکر میں متشکل کرنے کے لئے معروفِ جدوجہد ہوئے تو انہوں نے ایک دن مجھے یاد فرمایا اور کہا کہ میں جانتا ہوں کہ یہ تحریک جسے لے کر ہم اٹھے ہیں، تمہارے لئے تقاضائے دین ہے۔ اس میں ہمارا مقابلہ تین محاذوں پر ہوگا ـــــ انگریز، ہندو اور نیشنلسٹ علماء ـــــ جو "قال اللہ و قال الرسول" کے پردے میں اس تحریک کی مخالفت کریں گے۔ پہلے دونوں دشمنوں سے ہم نمٹ لیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ تیسرا محاذ تم سنبھال لو۔

طلوعِ اسلام کا اجراء

اور اس طرح اپریل ۱۹۳۸ء میں طلوعِ اسلام کا اجراء عمل میں آیا۔ اُس وقت گنتی کے دو چار علماء کرام کے سوا، باقی سب اس تحریک کے مخالف تھے ـــــ (مولانا) ابوالکلام آزاد، حسین احمد مدنی، احمد سعید دہلوی، مفتی کفایت اللہ[1]، ان کے سرخیل تھے اور ان کے علم و فضل کی دھاک، ہندوستان ہی میں نہیں، تمام عالمِ اسلام میں بیٹھی ہوئی تھی ـــــ یہ سب ایک طرف تھے اور طلوعِ اسلام تنہا دوسری طرف۔ اس نے اُن کی یورشوں کا مقابلہ کس جرأت سے کیا اور انہیں ہر میدان میں کس طرح عبرت آموز شکست ہوئی، اس پر اُس زمانے کے طلوعِ اسلام کے فائل شاہد ہیں۔ مابہ النزاع مسائل دو ہی تھے۔ یعنی:-

(۱) اُن کا دعویٰ تھا کہ ایک ملک یا مملکت کی حدود میں بسنے والے مسلم اور غیر مسلم ـــــ ہندو اور مسلم ـــــ مل کر ایک قوم بن جاتے ہیں۔ اس قوم کی اپنی مملکت ہوتی ہے اور اپنی حکومت۔

اس کے برعکس، ہمارا دعویٰ یہ تھا کہ قرآن کریم کی رُو سے، معیارِ قومیت، حسب نسب، رنگ، خون، وطن یا مملکت کا اشتراک نہیں، بلکہ ایمان کا اشتراک ہے۔ مسلمان، خواہ وہ دنیا کے کسی حصے میں بستے ہوں، ایک قوم کے افراد ہیں۔ اور غیر مسلم، خواہ وہ مسلمانوں کے ساتھ ایک ہی ملک میں کیوں نہ رہتے ہوں، دوسری قوم۔ اس نظریۂ قومیت کی رو سے، ہندوستان میں بسنے والے مسلمان اور غیر مسلم، دو الگ الگ قومیں ہیں۔ اسے دو قومی نظریہ یا (TWO NATION THEORY) کہا جاتا ہے۔

اسی حقیقت کو اقبالؒ نے ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ:-

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا
بنا ہمارے حصارِ ملّت کی اتحادِ وطن نہیں ہے!

---

[1] جمعیت العلماء ہند کے ممتاز ارکان۔

(۲) دوسرا نکتۂ اختلاف یہ تھا کہ نیشنلسٹ علماء کہتے تھے کہ جب ہندوستان کے ہندو اس امر کی اجازت دیتے ہیں کہ آزاد ہندوستان میں، مسلمانوں کے عقائد و عبادات اور شخصی قوانین پر کسی قسم کی پابندی نہیں ہوگی، تو پھر ہمیں الگ مملکت قائم کرنے کی ضرورت کیا ہے؟ اور ہمارا دعویٰ یہ تھا کہ اسلام، عقائد و عبادات اور شخصی قوانین ہی کا نام نہیں۔ یہ انسانی زندگی کے ہر گوشے کو محیط ہے۔ اور جب تک زندگی کے ہر شعبے پر احکام و قوانینِ خداوندی کی حکمرانی نہ ہو، نہ مسلمان اپنے آپ کو آزاد تصوّر کر سکتا ہے، نہ قرآنی مومن نیشنلسٹ علماء کا یہی مسلک تھا جس پر تنقید کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ: ؎

مُلاّ کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
نادان یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

ہمارے ان دونوں دعاوی کا نام نظریۂ پاکستان تھا۔ دس برس تک، قائدِ اعظمؒ اور ان کے رفقاء، مسلسل اور پیہم ان دعاوی کو دہراتے رہے۔ یعنی یہ کہ اسلام کی رُو سے ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں۔ اور مسلمان، صحیح اسلامی زندگی بسر کر نہیں سکتے جب تک ان کی اپنی آزاد مملکت نہ ہو۔ دس برس کی مسلسل جنگ کے بعد، بفضلِ ایزدِ متعال، پاکستان وجود میں آگیا۔ اور ۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء کو، اس کے یومِ تاسیس کے تین دن بعد، ہم نے اپنی آزاد مملکت میں پہلی نمازِ عید ادا کی ـــــ وہ عید جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا تھا کہ: ؎

آزادی کی پہلی عید

عیدِ آزاداں شکوہِ ملک و دیں
عیدِ محکوماں ہجومِ مؤمنیں

اس میں شبہ نہیں کہ اُس وقت بھی غم و آلام کے بادل ہمارے سروں پر منڈلا رہے تھے۔ ہندو نے قتل و غارت گری کا بازار گرم کر رکھا تھا اور ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں، مہاجرین کے لٹے پٹے قافلے، بخاک و خون غلطیدہ، اس نوزائیدہ مملکت کی ذمہ داری بن رہے تھے۔ لیکن اس کے باوجود، ہم نہ افسردہ تھے نہ پژمردہ۔ اس لئے کہ اگر آخرِ شب کے یہ جھلملاتے ہوئے چراغ گل ہو رہے تھے تو سامنے پاکستان کے مستقبل کا آفتابِ جہاں تاب، ضوفشانیوں کی ہزار دنیائیں اپنے جلو میں لئے اُبھرتا نظر آرہا تھا، اور افق کے اس پار سے، یہ نویدِ جانفزا، باعثِ صد تسکین اور وجہ ہزار تسلّی ہو رہی تھی ـــــ کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا۔

پاکستان کا تصوّر دینے والا اقبالؒ اس سے نو سال پہلے دنیا سے رخصت ہو چکا تھا اور اسے عملاً متشکل کرنے والا قائدِ اعظمؒ ایک سال بعد اپنے رفیق سے جا ملا۔ اور اس کے بعد، دنیا نے بصد حیرت و استعجاب یہ تماشہ دیکھا کہ جس بنیاد پر اس مملکت کی عمارت استوار ہوئی تھی، اس قوم نے اسے خود اپنے ہاتھوں سے کھود ڈالا ـــــ كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنْكَاثًا۔ (۱۶/۹۲) "اُس بڑھیا کی طرح جس نے دن بھر بڑی محنت اور مشقت سے سوت کاتا اور شام کو اسے خود اپنے ہاتھوں ادھیڑ دیا۔" ـــــ اور تعجب بالائے تعجب کہ ساری قوم ہی اس ادھیڑنے کے شغل میں مصروف ہو گئی۔

زوال کی ابتدا

(معاف فرمائیے) اس "پاگل خانے" میں طلوعِ اسلام کی ایک آواز تھی جو پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ ارے دیوانو! سوچو کہ جو کچھ تم کر رہے ہو، اس کا انجام کیا ہوگا؟ انہوں نے ایک طرف پاکستان میں بسنے والے مسلمانوں اور غیر مسلموں کو ایک قوم قرار دے دیا اور اس طرح دو قومی نظریہ کا خود ہی ابطال کر دیا۔ پھر انہوں نے صوبائی (؟)تی اور بنگالی، پٹھان، پنجابی، سندھی، بلوچ کے امتیازات کی گرہیں مضبوط کر کے ایمان کے اشتراک کی بنا پر امتِ واحدہ کے تصوّر سے (؟)۔ باقی رہا دوسرا دعویٰ (یعنی یہ کہ یہ مملکت اس لئے حاصل کی گئی ہے کہ ہم یہاں قوانین خداوندی نافذ کر سکیں) سو اسے

"اسلام کے اجارہ داروں" نے عملاً ناممکن بنا دیا۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ "مملکت کا کوئی قانون کتاب وسنت کے خلاف نہیں ہوگا"۔ اور طلوع اسلام نے انہیں متنبہ کیا کہ یاد رکھو! کتاب وسنت کی رُو سے کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں ہو سکے گا جو تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہو۔ قرآنِ کریم کو بنیاد قرار دے کر ضابطۂ قوانین مرتب کرو۔ اس پر انہوں نے طلوع اسلام کو منکرِ حدیث اور منکرِ سنت قرار دے کر کفر کا فتویٰ صادر فرما دیا۔ اور اپنے اُسی مطالبہ کو دہراتے رہے۔ بالآخر انہیں تئیس برس کے بعد یہ تسلیم کرنا پڑا کہ کتاب و سنت کی بنیادوں پر فی الواقعہ ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا جسے تمام فرقے متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کر لیں۔ (ملاحظہ ہو مودودی صاحب کا بیان شائع شدہ ایشیا مورخہ ۲۳ر اگست ۱۹۷۰ء) لیکن اتنے میں ہماری نئی نسل، یہ سمجھ کر کہ اسلام اب ناممکن العمل ہو چکا ہے، سیکولر حکومت کے تصوّر پر آ چکی تھی۔ مطالبۂ پاکستان کے دونوں ستون یوں منہدم ہو گئے —— تھے یہ ہی دو حساب سو یوں پاک ہو گئے۔

بنگالی - پٹھان - پنجابی - سندھی - بلوچ کے امتیاز نے جُداگانہ قومیتوں کے جراثیم کی پرورش کی اور علما حضرات کے اس ناممکن العمل مطالبہ اور باہمی سر پھٹول نے سیکولر حکومت کے تصوّر کو عام کیا۔ اس طرح پاکستانی مسلمانوں میں کوئی شئے وجۂ اشتراک نہ رہی۔ اس کا پہلا نتیجہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی صورت میں رونما ہوا۔ اور اب وہی رَو مغربی پاکستان میں چل رہی ہے۔

چار قوموں کا نظریہ

یہاں ۱۹۶۸ء میں یہ آواز بلند ہوئی (اور اس میں فیض احمد فیض اور جوشؔ ملیح آبادی قسم کے لوگ پیش پیش تھے) کہ مغربی پاکستان میں ایک قوم نہیں چار قومیں بستی ہیں۔ (ملاحظہ ہو طلوع اسلام بابت مئی ۱۹۷۲ء - صفحہ ۲۲) یہ آواز بڑی خطرناک تھی اور پاکستان کو ختم کر دینے کا نہایت مؤثر حربہ۔ اس لئے کہ جب آپ کسی قوم کا الگ وجود تسلیم کرا لیتے ہیں تو اس کے بعد اس کے جداگانہ آزاد مملکت کے مطالبہ کو ردّ نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے مطالبۂ پاکستان کی بنیاد بھی تو اسی دعویٰ پر تھی کہ ہم ایک الگ قوم ہیں۔ جونہی ہم نے اس دعویٰ کو تسلیم کرا لیا، پاکستان کی جداگانہ مملکت کا مطالبہ ناقابلِ استرداد ہو گیا۔ لیکن جب آپ ایک قوم کی جگہ متعدد اقوام کا وجود تسلیم کر لیں، تو جداگانہ مملکت کا وجود خطرہ میں پڑ جاتا ہے۔ پاکستان میں چار قومیتوں کا نظریہ، اس مملکت کے جداگانہ وجود کو ختم کرنے کا قدمِ اوّل تھا۔ "چار قوموں" کا یہ سپنولیہ خاموشی ہی خاموشی میں پرورش پاتا چلا گیا تاآنکہ اب یہ خطرناک اژدہا بن کر پھنکارتا پھرتا ہے۔ سرحد میں یہ بات عام ہو چکی ہے۔ جی۔ ایم۔ سیّد مُصِر ہے کہ سندھیوں کو الگ قوم تسلیم کیا جائے۔ بلوچستان کے وزیرِ اعلیٰ عطاء اللہ مینگل کا یہ بیان ابھی حال ہی میں (۲۷ر جولائی ۱۹۷۲ء کے نوائے وقت میں) شائع ہوا ہے کہ "نیشنل عوامی پارٹی، بچے کھچے پاکستان میں چار اقوام کی موجودگی کی قائل ہے"۔

اتنا ہی نہیں۔ یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ پاکستان میں سیکولر حکومت قائم ہوگی —— اور یہ بات نئی نہیں اسے آج سے بہت پہلے بلند کیا گیا تھا۔ ۱۹۶۴ء میں، پاکستان کے (سابق) چیف جسٹس، منیر صاحب نے پاکستان ٹائمز میں ایک مبسوط مقالہ لکھا، جس کا عنوان تھا (DAYS TO REMEMBER) اس کے آخر میں انہوں نے کہا تھا کہ:-

تشکیلِ پاکستان کے وقت کسی کے ذہن میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ پاکستان ایک اسلامی مملکت ہو گی۔

جسٹس منیرؔ صاحب کے تتبع میں، ہماری نئی نسل کے ایک نوجوان نے، اسی اخبار کی ۱۲ر جولائی ۱۹۶۴ء کی اشاعت میں لکھا تھا کہ:-

پاکستان کی تشکیل کا اصل مقصد تو سیاسی اور معاشی اقتدار حاصل کرنا تھا۔ لیکن اس مطالبہ کو عوام کے سامنے جذباتی، اور مذہبی سوال بنا کر پیش کیا گیا تاکہ اس سے یہ عوامی تحریک بن سکے۔ (طلوعِ اسلام - اگست ۱۹۶۴ء)

یہ کہتے ہوئے ہمارے اس عزیز کو اتنا خیال بھی نہ آیا کہ اس سے وہ بانیٔ پاکستان کے خلاف ایسا الزام عائد کر رہا ہے جس کی جرأت ان کے بڑے سے بڑے مخالف کو بھی نہ ہوئی تھی۔ (یہ ضمنی بات تھی)۔ پہلے یہ آواز دبی دبی سی اُٹھ رہی تھی، لیکن مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد اب اس کا الاپ نہایت اونچے سُروں میں شروع ہو گیا ہے۔ میں اس مقام پر اس کی دو ایک مثالیں پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔ کوئی صاحب ہیں پروفیسر احمد حسن دانی۔ ان کا ایک طویل مقالہ (بعنوان پاکستان بیئنگ گُڈ) جریدۂ پاکستان ٹائمز کی ۱۸ جون ۱۹۷۲ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ اس میں انہوں نے لکھا تھا:۔

> پاکستانی قومیت کی بنیاد اسلام کی روحانی اقدار نہیں کیونکہ اسے اسلام کے کسی فلسفہ کی سند حاصل نہیں۔ اس کی بنیاد وہ تاریخی عوامل ہیں جن سے یہاں کے مسلمان دوچار تھے۔

شیخ حامد محمود صاحب پاکستان کی ایک جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ ان کا ایک مبسوط مقالہ روزنامہ پاکستان ٹائمز کی ۲۶ جون ۱۹۷۲ء کی اشاعت میں شائع ہوا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب صدر بھٹو مذاکرات کے لئے شملہ تشریف لے جا رہے تھے۔ اس میں انہوں نے لکھا تھا:۔

> اس مقام پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان کی آئیڈیالوجی کی بھی وضاحت کر دی جائے کیونکہ یہ بات بڑی شدومد سے کہی جا رہی ہے کہ بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے سے دو قومی نظریہ کی تردید ہو جاتی ہے۔ پاکستان کی آئیڈیالوجی کے متعلق سادہ سے الفاظ میں یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اس سے یہ ہرگز مقصود نہیں کہ پاکستان میں اسلامی مملکت یا تھیاکریسی یا "پان اسلامک" سیاسی نظام قائم کیا جائے۔ یہ چیز مسلمانوں کی ہندوؤں سے علیحدگی کا منطقی نتیجہ تو ہو سکتی ہے لیکن یہ اس آئیڈیالوجی کی بنیاد ہرگز نہیں۔ اس آئیڈیالوجی کی بنیاد، دو قومی نظریہ ہے۔ سادہ الفاظ میں دو قومی نظریہ کا مفہوم یہ تھا کہ جن علاقوں میں مسلمان اکثریت میں تھے انہیں ہندوستان سے الگ کر لیا جائے۔ بالفاظِ دیگر مسلمان اقلیت کو ہندو اکثریت کے تغلب سے آزاد کرا لیا جائے۔ دو قومی نظریہ کے لئے پہلے ایک غیر قوم —— یعنی ہندوؤں —— کے وجود کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ اس کا اطلاق کسی اور مسلم اقلیت پر نہیں ہو سکتا۔ بنا بریں، اگرچہ یہ کہنا ممکن یا مناسب نہ ہوگا لیکن ہوگا یہ بالکل منطقی اور جائز کہ ہندوؤں سے علیحدگی کے بعد، ہندوستان کے شمال مغرب اور شمال مشرق بلکہ جنوبی ہند میں، مسلمانوں کی دو، تین یا پانچ مسلم ریاستیں ہو سکتی ہیں۔

...وہ کہتے ہیں کہ:۔

> ...پاکستان کی آئیڈیالوجی سے مراد ایک اسلامی مملکت کا قیام ہے جیسا کہ بعض لوگ نہایت شدّومد اور حتم کے ساتھ کہتے ہیں، تو پھر میں یہ کہوں گا کہ ہمیں کسی اور اسلامی مملکت، مثلاً افغانستان یا ایران کے ...ـہ ہو جانا چاہیے۔ (۱)

...اقتباسات کے لئے سامعین سے معذرت خواہ ہوں۔ اگرچہ مقالہ نگار کا اسلوبِ بیان بڑا الجھا ہوا سا ہے لیکن

---

(۱) ...ہے کہ قرآنی اسلام کی رو سے تمام دنیا کے مسلمان ایک قوم کے افراد ہوتے ہیں اور ان کی ایک ہی مملکت۔ ...میں یہی حالت تھی۔

مجھے امید ہے کہ جو کچھ وہ کہنا چاہتے ہیں، سامعین اُسے سمجھ گئے ہوں گے۔

بنگلہ دیش کی علیحدگی کے سلسلہ میں وہ کہتے ہیں کہ مسلم لیگ کے ۱۹۴۰ء کے ریزولیوشن میں، پاکستان کے شمال جنوب اور شمال مشرق میں دو جداگانہ آزاد مملکتوں کا تصور پیش کیا گیا تھا۔ اس لئے اگر مشرقی پاکستان ہم سے الگ ہو گیا ہے تو یہ قرارداد لاہور کے عین مطابق ہے۔ واضح رہے کہ دو آزاد مملکتوں کا یہ شوشہ پہلے مولانا بھاشانی نے چھوڑا تھا۔ پھر اسے شیخ مجیب الرحمٰن نے اُبھارا۔ اور اب اسے یہاں بھی عام کیا جا رہا ہے۔

دو الگ الگ مملکتیں

یہ ہیں برادرانِ عزیز! وہ بھانت بھانت کی بولیاں جو اس وقت نظریۂ پاکستان اور دو قومی نظریہ کے متعلق یہاں بولی جا رہی ہیں۔ ——— ان حالات کے ماتحت، میں نے ضروری سمجھا ہے کہ کم از کم اتنا تو بتا دیا جائے کہ قائدِ اعظمؒ اس باب میں کیا کہا کرتے تھے۔ مجھ پر یہ ذمہ داری ایک تو اس لئے عائد ہوتی ہے کہ، جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا ہے، مملکتِ پاکستان کا تحفظ میرا جزوِ ایمان ہے۔ اور دوسرے اس لئے کہ مجھے قریب دس سال تک قائدِ اعظمؒ کے قرب کی سعادت حاصل رہی ہے۔ کل روزِ قیامت اگر انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ تمہارے سامنے میرے خلاف اس قسم کے الزامات تراشے جاتے تھے۔ میں اپنی مدافعت کے لئے وہاں موجود نہیں تھا۔ تم ابھی زندہ تھے اور سب کچھ تمہارے علم میں بھی تھا۔ تم سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ حقیقتِ حال لوگوں پر واضح کر کے میری پوزیشن صاف کر دو، تو میں ان کے اس سوال کا جواب کیا دوں گا؟ یہ ٹھیک ہے کہ ابھی ہم میں اس دور سے متعلق ایسے لوگ موجود ہیں جو ان سوالات کا جواب مجھ سے بھی بہتر طریق پر دے سکتے تھے لیکن ان کی جو کیفیت ہے اسے بیان کرنے سے میری نگاہیں مارے شرم کے زمین میں گڑ جاتی ہیں۔ آپ کو یاد ہو گا کہ کوئی دو سال ادھر کا ذکر ہے، پاکستان ٹیلی ویژن نے، تحریکِ پاکستان میں حصہ لینے والے بعض نامور

مسلم لیگی راہ نمایانِ کرام

مشاہیر کو بلایا تھا کہ وہ بتائیں کہ مطالبۂ پاکستان کا جذبۂ محرکہ کیا تھا۔ اس دعوت پر لبیک کہتے ہوئے چوہدری خلیق الزمان، مسٹر حسین امام، راجہ محمود آباد۔ شاہ عزیز الرحمٰن جیسے بزرگ ٹیلی ویژن پر تشریف لائے اور انہوں نے جو کچھ فرمایا، مجھے یقین ہے کہ اسے سُن کر قائدِ اعظمؒ کی روح تڑپ اٹھی ہو گی۔ انہوں نے وہی کہا تھا جسے نظریۂ پاکستان کے مخالفین کی طرف سے دہرایا جاتا ہے۔ یعنی یہ کہ ہندو کی تنگ نظری نے ہمیں مجبور کر دیا تھا کہ ہم اُس سے علیحدہ ہو جائیں۔ اگر وہ ذرا کشادہ دلی سے کام لیتا اور ہمارے معاشی استحصال سے باز آ جاتا تو ہم کبھی جداگانہ مملکت کا مطالبہ نہ کرتے۔ اِنّا للہ و انا الیہ راجعون۔ ؎

زگلفروشں نالم کز اہل بازار است

تپاکِ گرمئ رفتارِ باغبانم سوخت!

قائدِ اعظمؒ کے ارشادات

لہٰذا عزیزانِ من! یہ قرعۂ فال اس دیوانے کے نام ہی پڑا ہے کہ یہ بتایا جائے کہ قائدِ اعظمؒ نے اس سلسلہ میں کیا کہا تھا۔ یعنی اس سلسلہ میں کہ:-

(۱) کیا مطالبۂ پاکستان سے مقصود ایک اسلامی مملکت کا قیام تھا یا محض ہندو کے معاشی استحصال سے چھٹکارا حاصل کرنا۔

(۲) کیا دو قومی نظریہ اس لئے پیش کیا گیا تھا کہ یہ اسلام کا تقاضا ہے۔ یا اسے محض ایک حربہ کے طور پر اختیار کیا گیا تھا۔

اور ——— (۳) قائدِ اعظمؒ کے پیش نظر ایک پاکستان کا تصور تھا یا دو الگ الگ مملکتوں کا۔

اس سلسلہ میں، میں ان باتوں کا تذکرہ بالکل نہیں کروں گا جو دس سال کی ملاقاتوں میں قائدِ اعظمؒ کے ساتھ زبانی ہوتی رہیں۔ اس لئے کہ ان کی سند کوئی سن نہیں ہوگی۔ میں صرف قائدِ اعظمؒ کی ان تقاریر اور بیانات کے اقتباسات پیش کروں گا جو چھپ کر شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں بنیادی طور پر، وہ دو جلدیں سرِ فہرست ہیں جنہیں شیخ محمد اشرف، پبلشر، لاہور نے شائع کیا تھا۔ حوالے کے لئے، جلد اوّل کا ۱۹۵۲ء کا اور جلد دوم کا ۱۹۴۷ء کا ایڈیشن میرے سامنے ہے۔ (بغرض سہولت میں ان کے صفحات تک کا بھی حوالہ دیتا جاؤں گا)۔

سیاست اور مذہب

سب سے پہلے اس سوال کو لیجئے کہ قائدِ اعظمؒ کی سیاست، معاشی یا سیاسی مقاصد پر مبنی تھی یا اس میں مذہب کو بھی کوئی دخل تھا! قائدِ اعظمؒ کا حریفِ اوّل (مہاتما) گاندھی تھا۔ اس نے اعتراض کیا کہ مسٹر جناح خواہ مخواہ مذہب کو سیاست میں گھسیٹ لاتے ہیں۔ مذہب کو سیاست سے کیا واسطہ؟ اس کے جواب میں قائدِ اعظمؒ نے یکم جنوری ۱۹۴۰ء کو مسٹر گاندھی کے نام ایک تفصیلی خط لکھا اور اس میں کہا کہ:-

آج آپ (یعنی مسٹر گاندھی) اس سے انکار کرتے ہیں کہ قومیت کی تشکیل میں مذہب ایک بہت بڑا عنصر ہے۔ لیکن جب خود آپ سے یہ سوال کیا گیا تھا کہ زندگی میں آپ کا مقصود کیا ہے، وہ کونسی قوتِ محرکہ ہے جو ہمیں آمادہ بہ عمل کرتی ہے۔ کیا وہ مذہب ہے یا سیاست یا عمرانی اصلاح۔ تو آپ نے کہا تھا کہ "وہ خالص مذہبی جذبہ ہے"۔ (لہٰذا مذہب اور سیاست دو الگ الگ شعبے ہو نہیں سکتے)۔ آپ تمدنی، معاشی، سیاسی۔ اور خالص مذہبی امور کو الگ الگ شعبوں میں تقسیم کر ہی نہیں سکتے۔ جس مذہب کو نوعِ انسان کے معاملات سے واسطہ نہیں، میں اسے مذہب ہی تسلیم نہیں کرتا۔ مذہب، انسان کے ہر معاملہ کے لئے اخلاقی بنیاد مہیا کرتا ہے۔ اگر مذہب نہ ہو تو انسانی اعمال اس بنیاد سے محروم رہ جاتے ہیں۔ اور جب زندگی ایسی بنیاد سے محروم رہ جائے تو وہ انسانی زندگی نہیں محض غوغہ آرائی اور ہنگامہ پروری بن کر رہ جاتی ہے جس میں شور و شغب تو بہت ہوتا ہے لیکن مقصد کچھ نہیں ہوتا۔

(تقاریر۔ جلد اوّل۔ صفحہ ۴۰ - ۱۳۹)

میں سمجھتا ہوں کہ زیرِ نظر سوال کے جواب کے لئے صرف یہی اقتباس کافی ہوگا لیکن چونکہ بات اجمال سے نہیں بنے گی اس لئے میں اس کی تفصیل بھی پیش کر دینا چاہتا ہوں۔

اسلام۔ اسلام اور صرف اسلام

(۱) قائدِ اعظمؒ نے، ۱۳ر نومبر ۱۹۳۹ء کو، ریڈیو پر، قوم کے نام، پیغامِ عید، نشر کیا تھا۔ اس میں انہوں نے قرآنی تعلیم کے مختلف گوشوں کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا تھا:-

معاشی احیاء ہو یا سیاسی آزادی۔ اسے آخر الامر زندگی کے کسی گہرے مفہوم پر مبنی ہونا چاہیئے اور مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ ہمارے نزدیک زندگی کا وہ گہرا مفہوم، اسلام اور روحِ اسلام ہے۔ (تقاریر۔ جلد اوّل۔ صفحہ ۱۰۸)

(۲) مارچ ۱۹۴۴ء میں، پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کانفرنس کے آخری اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے، قائدِ اعظم نے فرمایا کہ ذات برادری کی تقسیم، اور شیعہ سنی کی تفریق ہمیں ایک قوم نہیں بننے دے گی۔ ان تفریقات کو ختم کر دیجئے۔ یاد رکھیئے:-

ہماری کشتی کا لنگر اور ہماری عمارت کی بنیاد، اسلام ہے۔ (تقاریر - جلد دوم - ص ۸۹)

(۳) انہوں نے، ۲۱ نومبر ۱۹۴۵ء کو فرنٹیئر مسلم لیگ کانفرنس، پشاور سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:-

(سوال یہ ہے کہ ہم جس آزادی کے لئے جد و جہد کر رہے ہیں اس کے حصول کے لئے ہمارے پاس قوت کونسی ہے)۔ ہماری وہ قوت، ہمارا مذہب، ہماری ثقافت اور اسلامک آئیڈیلز ہے۔ (تقاریر - جلد دوم - ص ۳۳۸)

(۴) انہوں نے ۱۹۴۵ء میں، اپنے پیغامِ عیدین قوم سے کہا:-

یاد رکھیئے، اسلام صرف روحانی احکام اور نظریات، یا مذہبی رسوم و مراسم کا نام نہیں - یہ ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جو اسلامی معاشرے کے ہر گوشے کو محیط ہے ـــــ خواہ اس کا تعلق انفرادی زندگی سے ہو اور خواہ حیاتِ اجتماعیہ سے۔ (تقاریر - جلد دوم - ص ۳۰۱)

یہ تو رہا اسلام کی عمومی حیثیت کے متعلق - اب آیئے اس سوال کی طرف کہ مطالبۂ پاکستان کا جذبۂ محرکہ کیا تھا - اس سلسلہ میں انہوں نے

(۵) ۲۱ نومبر ۱۹۴۵ء کو فرنٹیئر مسلم لیگ کانفرنس سے، خطاب کرتے ہوئے فرمایا:-

مسلمان اس لئے پاکستان کا مطالبہ کرتے ہیں کہ اُس مملکت میں وہ اپنے ضابطۂ زندگی - اپنے ثقافتی نشو و نما اور روایات اور اسلامی قوانین کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ (تقاریر - حصہ دوم - ص ۳۳۳)

(۶) اسی حقیقت کو انہوں نے، اُسی ماہ، اسلامیہ کالج پشاور کے طلبا سے خطاب کرتے ہوئے دہرایا:- (ایضاً ص ۳۵۱)

(۷) انہوں نے ۲۷ نومبر ۱۹۴۵ء کو ایڈورڈس کالج پشاور کے طلبا کے سپاسنامہ کا جواب دیتے ہوئے کہا:-

ہم، ہندو اور مسلمان دو قومیں ہیں - نہ صرف یہ کہ ہمارا مذہب ایک دوسرے سے مختلف ہے بلکہ ہمارا کلچر بھی الگ الگ ہے - ہمارا مذہب ہمیں ایک ایسا ضابطۂ حیات عطا کرتا ہے جو زندگی کے ہر شعبے کو محیط ہے - ہم اسی ضابطہ کے آئیڈیلز کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں لیکن ہندو لیڈر شپ، رام راج قائم کرنا چاہتی اور اس راج میں مسلمانوں کو اقلیت کی پوزیشن دینا چاہتی ہے۔ (تقاریر - حصہ دوم - ص ۳۴۶)

آپ نے غور فرمایا عزیزانِ من! کہ یہ ہندو کا معاشی استحصال تھا جس نے ہمیں مطالبۂ پاکستان پر مجبور کیا تھا یا اُن کا یہ منصوبہ کہ مسلمان اسلام کے مطابق نہیں بلکہ رام راج کے تابع زندگی بسر کریں! اس سلسلہ میں قائدِ اعظم رحمنے،

(۸) پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی سالانہ کانفرنس منعقدہ ۱۸ مارچ ۱۹۴۴ء میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:-

اسلامک اسٹیٹ

پاکستان کا مطالبہ اب کروڑوں مسلمانوں کے نزدیک جزوِ ایمان بن چکا ہے یہ اب ایک نعرہ نہیں رہا۔ مسلمانوں نے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ ان کی حفاظت، نجات اور مقدّر کا واحد ذریعہ پاکستان ہے - وہ پاکستان کہ جب وہ وجود میں آ گیا تو ساری دنیا میں یہ آواز گونج اُٹھے گی کہ ہاں! اب ایک ایسی مسلم اسٹیٹ کا قیام عمل میں آ گیا ہے جو اسلام کے ماضی کی درخشندہ عظمت و شوکت کا احیاء کرے گی۔ (تقاریر - جلد دوم - ص ۸۵)

(۹) یہاں قائدِ اعظم رحنے مملکتِ پاکستان کو وہ مسلم اسٹیٹ کہا ہے جو اسلام کے صدرِ اوّل کی عظمت و شوکت کا احیاء کرے گی - آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ (دہلی) ۲۴ اپریل ۱۹۴۳ء کے خطاب میں انہوں نے فرمایا تھا:-

ہمارے متعلق بہت سی غلط فہمیاں پھیلائی جا رہی ہیں۔ بہت سے فتنے برپا کئے جاتے ہیں۔ پوچھا یہ جاتا ہے کہ کیا پاکستان میں اسلامی حکومت قائم ہوگی؟ ان بھلے مانسوں سے کوئی پوچھے کہ کیا یہ بھی کوئی ایسی بات ہے جس کے متعلق کچھ پوچھنے کی ضرورت پیش آئے؟ میں تو سمجھتا ہوں کہ ایسا سوال کرنے والے ہمارے خلاف..... (VOTE OF CENSURE) پاس کرتے ہیں۔ (تقاریر۔ جلد اوّل۔ ص۵۵۵)

(۱۰) پاکستان کو اس قسم کی اسلامی مملکت بننا تھا جس کا تصوّر علامہ اقبالؒ نے دیا تھا۔ چنانچہ، یومِ اقبال منعقدہ دسمبر ۱۹۴۴ء کے سلسلہ میں پیغام دیتے ہوئے قائدِ اعظمؒ نے فرمایا کہ:۔

اسلامی نظریاتِ زندگی پر یقینِ محکم رکھتے ہوئے، اقبالؒ ان معدودے چند مشاہیر میں سے تھا جنہوں نے اس امکان کو روشن کیا کہ ہندوستان کے شمال مغربی اور شمال مشرقی حصوں میں جو مسلمانوں کے تاریخی اماکن ہیں، ایک اسلامک اسٹیٹ قائم کی جاسکتی ہے۔ (تقاریر۔ جلد دوم۔ ص۲۳۲)

(۱۱) قائدِ اعظمؒ نے، اس آواز کو، کہ پاکستان ایک اسلامی مملکت ہوگی، ہندوستان کی چار دیواری تک ہی محدود نہیں رکھا۔ انہوں نے اسے مغربی ممالک تک میں عام کر دیا۔ انہوں نے ۸ نومبر ۱۹۴۵ء کو ایسوشی ایٹڈ پریس اوف امریکہ کے نمائندہ کو انٹرویو دیتے ہوئے دوٹوک الفاظ میں بتایا:۔

پاکستان ایک مسلم اسٹیٹ ہوگی۔ (تقاریر۔ جلد دوم۔ ص۳۲۶)

انہوں نے، لندن میں، مسلم لیگ کے زیرِ اہتمام ایک جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے ۱۴ دسمبر ۱۹۴۶ء کو فرمایا کہ:۔

ہم ایک ایسی آزاد مملکت چاہتے ہیں جس میں ہم اپنے تصوراتِ حیات کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔

(تقاریر۔ حصہ دوم۔ ص۵۰۳)

میں پوچھنا چاہتا ہوں برادرانِ گرامی قدر! کہ کیا ان اقتباسات کے بعد اس حقیقت کے سمجھنے میں کوئی دشواری پیش آسکتی ہے کہ قائدِ اعظمؒ کے نزدیک پاکستان کا مقصد کیا تھا اور وہ اسے ایک اسلامی مملکت دیکھنا چاہتے تھے یا سیکولر اسٹیٹ!

اگر اسلام کو مٹنے سے بچانا چاہتے ہو تو.....

اگر ان کے اس قدر اعلانات بھی ناکافی ہوں تو ان میں دو ایک ایسے بیانات کا اضافہ کر لیجئے جن میں انہوں نے برملا کہہ دیا تھا کہ اگر تم اس حصۂ ارض پر اسلام کو باقی رکھنا چاہتے ہو تو اس کے لئے قیامِ پاکستان کے سوا کوئی صورت ممکن نہیں۔ انہوں نے ——

(۱۲) دس مارچ ۱۹۴۱ء کو مسلم یونیورسٹی یونین، علی گڑھ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:۔

اگر آپ چاہتے ہیں کہ اس ملک سے اسلام کا نام و نشان نہ مٹ جائے تو اس کے لئے پاکستان نہ صرف یہ کہ، ایک عملی نصب العین ہے بلکہ یہی اور صرف یہی، واحد نصب العین (GOAL) ہے۔

تقاریر۔ جلد اوّل۔ ص۲۶۷)

(۱۳) پھر انہوں نے، ۲۳ مارچ ۱۹۴۵ء کو، پاکستان ڈے کی تقریب پر پیغام دیتے ہوئے کہا:۔

ہماری حفاظت، نجات اور عزت و آبرو (کے تحفظ کا واحد ذریعہ) پاکستان ہے۔ (یاد رکھو) اگر ہم اس جدوجہد میں ناکام رہ گئے تو ہم تباہ ہو جائیں گے اور پھر اس برصغیر میں مسلمانوں کا اور اسلام کا نشان تک باقی

نہیں رہے گا۔ (تقاریر۔ جلد دوم۔ ص۲۵۵)

(۱۴) اب آیئے اپنے اس گم کردہ غلط بیں نوجوان کی طرف جس نے کہا تھا کہ مطالبۂ پاکستان کی اصلی بنیاد تو معاشی تھی لیکن اسے مذہب کا نقاب اسلئے اوڑھا دیا گیا کہ یہ عوامی جدوجہد بن سکے! اس مفروضہ کے ماتحت، اس نقاب کی ضرورت، حصولِ پاکستان سے پہلے تک تھی۔ قیامِ پاکستان کے بعد تو اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ لیکن دیکھئے کہ قیامِ پاکستان کے بعد بھی قائدِ اعظمؒ کیا کہتے رہے تھے۔ انہوں نے آزادیٔ پاکستان کی پہلی سالگرہ کی تقریب پر، ۱۴ اگست ۱۹۴۸ء کو بہ حیثیتِ گورنر جنرل آف پاکستان، قوم کے نام اپنے پیغام میں کہا تھا کہ:-

حصولِ پاکستان کے بعد

پاکستان کا قیام ایک ایسا محیر العقول واقعہ ہے جس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔ یہ دنیا کی سب سے بڑی مسلم اسٹیٹس میں سے ایک ہے۔ (گورنر جنرل کی حیثیت سے تقاریر کا مجموعہ ص۱۵۷)

یہ ان کی زندگی کا آخری پیغام تھا:-

(۱۵) انہوں نے، گورنر جنرل کی حیثیت سے، اکتوبر ۱۹۴۷ء میں خالقدینا ہال، کراچی میں افسروں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ:-

پاکستان کا قیام جس کے لئے ہم گزشتہ دس سال سے مسلسل کوشش کر رہے تھے، اب خدا کے فضل سے ایک حقیقتِ ثابتہ بن کر سامنے آچکا ہے۔ لیکن ہمارے لئے اس آزاد مملکت کا قیام مقصود بالذات نہیں تھا بلکہ ایک عظیم مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا۔ ہمارا مقصد یہ تھا کہ ہمیں ایک ایسی مملکت مل جائے جس میں ہم آزاد انسانوں کی طرح رہ سکیں اور جس میں ہم اپنی روشنی اور ثقافت کے مطابق نشوونما پا سکیں اور اسلام کے عدلِ عمرانی کے اصول آزادانہ طور پر رُو بہ عمل لائے جا سکیں۔ (ایضاً۔ ص۲۲)

اس مقام پر اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ جب قائدِ اعظمؒ پاکستان کو اسلامی مملکت قرار دیتے تھے تو وہ اس خطرہ سے بھی اچھی طرح آگاہ تھے جو اس مملکت کو "مذہب کے اجارہ داروں" کی طرف سے لاحق ہو سکتا تھا۔ اس سلسلہ میں انہوں نے بہت پہلے وارننگ دی تھی۔ ۱۱ اپریل ۱۹۴۶ء کو دہلی میں مسلم لیجسلیٹرز کا کنونشن منعقدہ ہوا۔ اس کے آخری اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا:-

تھیاکریسی نہیں

اسے اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ہم کس مقصد کے لئے یہ لڑائی لڑ رہے ہیں۔ ہمارا نصب العین کیا ہے! یاد رکھئے۔ ہمارا نصب العین تھیاکریسی نہیں۔ ہم تھیاکریٹک اسٹیٹ نہیں بنانا چاہتے۔ (تقاریر۔ جلد دوم۔ ص۳۸۶)

انہوں نے فروری ۱۹۴۸ء میں اہلِ امریکہ کے نام اپنے براڈ کاسٹ میں کہا:-

پاکستان کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی نے ابھی پاکستان کا آئین مرتب کرنا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس آئین کی آخری شکل کیا ہوگی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کا آئینہ دار جمہوری انداز کا ہوگا۔ اسلام کے یہ اصول آج بھی اسی طرح عملی زندگی پر منطبق ہو سکتے ہیں جس طرح وہ تیرہ سو سال پہلے ہو سکتے تھے۔ اسلام نے ہمیں وحدتِ انسانیت اور ہر ایک کے ساتھ عدل و دیانت کی تعلیم دی ہے۔ آئینِ پاکستان کے مرتب کرنے کے سلسلہ میں جو ذمہ داریاں اور فرائض ہم پر عائد ہوتے ہیں ان کا ہم پورا پورا احساس رکھتے ہیں۔ کچھ بھی ہو، یہ مسلّمہ

بات ہے کہ پاکستان میں کسی صورت میں بھی تھیاکریسی رائج نہیں ہوگی جس میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے کہ وہ (بزعمِ خویش) خدائی مشن کو پورا کریں۔ (تقاریر۔ بحیثیت گورنر جنرل۔ صـ۶۵)
یہی بات انہوں نے ۱۹ر فروری ۱۹۴۸ء کو اہلِ آسٹریلیا کے نام اپنے براڈکاسٹ میں کہی تھی۔ (ایضاً۔ صـ۵۸)

قرآنِ عظیم

یہاں سے عزیزانِ من! ایک اہم سوال سامنے آتا ہے، اور وہ یہ کہ قائدِاعظمؒ پاکستان کو اسلامی مملکت بھی بنانا چاہتے تھے اور اس کے ساتھ ہی اس میں، زمامِ اقتدار مذہبی پیشوائیت کے ہاتھ میں بھی نہیں دینا چاہتے تھے۔ تو پھر وہ، اس اسلامی مملکت میں قانون کا سرچشمہ اور آخری اتھارٹی کسے قرار دینا چاہتے تھے؟ قائدِاعظمؒ نے اس باب میں بھی اپنے خیالات نہایت وضاحت سے بیان فرما دیئے تھے جو ہماری نئی نسل اور قدامت پرست دونوں طبقوں کے لئے دلیلِ راہ بننے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہیں غور سے سنئے:۔

(۱) اپریل ۱۹۴۳ء کا ذکر ہے، صوبہ سرحد کی مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن نے قائدِاعظمؒ سے ایک پیغام کے لئے درخواست کی۔ آپ نے جواب میں فرمایا:۔

تم نے مجھ سے کہا کہ میں تمہیں کوئی پیغام دوں۔ میں تمہیں کیا پیغام دوں جبکہ ہمارے پاس پہلے ہی ایک عظیم پیغام موجود ہے جو ہماری راہ نمائی اور بصیرت افروزی کے لئے کافی ہے۔ وہ پیغام ہے خدا کی کتابِ عظیم، قرآنِ کریم۔ (تقاریر۔ جلد اوّل۔ صـ۵۱۶)

(۲) ۱۳ر نومبر ۱۹۴۵ء کو آپ نے قوم کے نام عید کا پیغام نشر فرمایا۔ اس زمانے میں ملک میں ہنگامے اور فسادات ہو رہے تھے۔ آپ نے قوم سے کہا کہ:۔

جب ہمارے پاس قرآنِ کریم ایسی مشعلِ ہدایت موجود ہے تو پھر ہم اس کی روشنی میں ان اختلافات کو کیوں نہیں مٹا سکتے۔ (تقاریر۔ جلد اول۔ صـ۱۰۸)

(۳) دسمبر ۱۹۴۳ء میں کراچی میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ اس کے آخری اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے پہلے خود ہی یہ سوال اٹھایا:۔

وہ کونسا رشتہ ہے جس سے منسلک ہونے سے تمام مسلمان جسدِ واحد کی طرح ہیں۔ وہ کونسی چٹان ہے جس پر ان کی ملّت کی عمارت استوار ہے۔ وہ کونسا لنگر ہے جس سے اس اُمت کی کشتی محفوظ کر دی گئی ہے۔

اس کے بعد خود ہی ان سوالات کا جواب ان الفاظ میں دیا:۔

وہ بندھن، وہ رشتہ، وہ چٹان، وہ لنگر خدا کی کتابِ عظیم قرآن مجید ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے ہم میں زیادہ سے زیادہ وحدت پیدا ہوتی جائے گی۔
ایک خدا، ایک کتاب، ایک رسول۔ فلہٰذا ایک قوم۔ (تقاریر۔ جلد دوم۔ صـ۵۰)

(۴) انہوں نے ۱۹۴۵ء میں، ملّت کے نام عید کے پیغام میں ایک ایسی حقیقت کشا بات کہی جس پر نگاہِ بصیرت ہمیشہ وجد

کرتی رہے گی۔ آپ نے فرمایا:۔

اس حقیقت سے ہر مسلمان واقف ہے کہ قرآن کے احکام مذہبی اور اخلاقی حدود تک محدود نہیں۔ مشہور مؤرخ گبن نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "بحر اطلانتک سے لے کر گنگا تک، ہر جگہ قرآن کو ضابطۂ حیات کے طور پر مانا جاتا ہے۔ اس کا تعلق صرف الٰہیات تک نہیں بلکہ وہ مسلمانوں کے لئے سول اور فوجداری قوانین کا ضابطہ ہے جس کے قوانین نوعِ انسان کے تمام اعمال و احوال کو محیط ہیں۔ اور یہ قوانین غیر متبدل منشائے خداوندی کے مظہر ہیں"۔

اس کے بعد قائدِ اعظمؒ فرماتے ہیں:۔

اس حقیقت سے سوائے جہلاء کے ہر شخص واقف ہے کہ قرآن مسلمانوں کا بنیادی ضابطۂ زندگی ہے جو معاشرت، مذہب، تجارت، عدالت، فوج، دیوانی، فوجداری اور تعزیرات کے ضوابط کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ مذہبی رسوم ہوں یا روزمرہ کے معمولات۔ روح کی نجات کا سوال ہو یا بدن کی صفائی کا اجتماعی حقوق کا سوال ہو یا انفرادی واجبات کا۔ عام اخلاقیات ہوں یا جرائم۔ دنیاوی سزا کا سوال ہو یا آخرت کے مؤاخذہ کا ——— ان سب کے لئے اس میں قوانین موجود ہیں۔ اسی لئے نبی اکرمؐ نے حکم دیا تھا کہ ہر مسلمان قرآنِ کریم کا نسخہ اپنے پاس رکھے اور اس طرح اپنا مذہبی پیشوا آپ بن جائے۔ (انہیں الگ مذہبی پیشواؤں کی ضرورت ہی نہیں)۔ (تقاریر۔ جلد دوم۔ صفحہ ۳۰۰)

یہ تھا وہ مکمل، غیر متبدل، ضابطہ جسے اس مملکتِ اسلامیہ کے لئے سرچشمۂ قوانین و ہدایت قرار دیا جانا مقصود تھا۔

جامع ملخص

اسلامی مملکتِ پاکستان کی اساس و ضوابط کے متعلق جو کچھ اس وقت تک کہا گیا ہے، آپ یقیناً چاہتے ہوں گے کہ میں ان کا جامع ملخص بھی آپ کے سامنے پیش کردوں۔ لیکن حسنِ اتفاق دیکھئے کہ اس تفصیل کو خود قائدِ اعظمؒ نے دو تین سوالات کے جواب میں، اس حسن و خوبی سے سمو دیا ہے کہ اس کے بعد اس باب میں کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ ہوا یہ کہ آپ اگست ۱۹۴۱ء میں حیدر آباد (دکن) تشریف لے گئے۔ وہاں عثمانیہ یونیورسٹی کے طلبا نے کچھ سوالات پوچھے۔ یہ سوالات، اور قائدِ اعظمؒ کی طرف سے دیئے گئے ان کے جواب، اورینٹ پریس آف انڈیا نے نشر کئے اور اس زمانے کے روزنامہ انقلاب (لاہور) نے شائع کئے۔ آپ بھی بغور سن لیجئے۔

سوال:۔ مذہب اور مذہبی حکومت کے لوازم کیا ہیں؟

جواب:۔ جب میں انگریزی زبان میں مذہب (RELIGION[1]) کا لفظ سنتا ہوں تو اُس زبان اور محاورے کی رُو سے، میرا ذہن لامحالہ خدا اور بندے کے باہمی پرائیویٹ تعلق کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ لیکن میں خوب جانتا ہوں کہ اسلام کے نزدیک مذہب کا یہ محدود اور مقید مفہوم نہیں۔ میں نہ کوئی مولوی ہوں نہ مُلّا۔ نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعویٰ ہے۔ البتہ میں نے قرآن مجید اور قوانینِ اسلام کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے۔ اس عظیم کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی۔ سیاسی ہو یا معاشی۔ غرضیکہ کوئی شعبہ

---

[1] ہمارے ہاں دقّت یہ پیش آجاتی ہے کہ قرآنِ کریم میں اسلام کے لئے دِین کا لفظ آیا ہے۔ اور لفظ دِین کے لئے انگریزی زبان میں کوئی لفظ نہیں۔ ان کے ہاں صرف (RELIGION) کا لفظ ہے جس کے معنی مذہب ہیں۔ دِین نہیں۔

کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطہ سے باہر ہو۔ قرآنِ کریم کی اصولی ہدایات اور طریق عمل نہ صرف مسلمانوں کے لئے بہترین ہیں بلکہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے لئے حسنِ سلوک اور آئینی حقوق کا جو حصّہ ہے، اس سے بہتر کا تصور ناممکن ہے۔

سوال:۔ اس سلسلہ میں اشتراکی حکومت کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب:۔ اشتراکیت، یا بالشویت یا اسی قسم کے دیگر معاشی و سیاسی مسالک درحقیقت اسلام اور اس کے نظامِ سیاست کی غیر مکمل اور بھونڈی سی شکلیں ہیں۔ ان میں اسلامی نظام کے اجزاء کا سا ربط و تناسب نہیں پایا جاتا۔

اب دیکھئے وہ تیسرا سوال اور اس کا جواب جو ہمارے نزدیک اس نظم مرصع کا مقطع کا بند ہے۔ سوال یہ تھا کہ:۔

اسلامی حکومت کے تصوّر کی امتیازی خصوصیات کیا ہیں؟

جواب:۔ اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ، قرآنِ مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآنِ کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت، دوسرے الفاظ میں، قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے۔ اور حکمرانی کے لئے آپ کو لامحالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہوتی ہے۔

اور یہ ہے عزیزانِ من! **نظریّۂ پاکستان** ——— اور یہ کچھ انہوں نے ۱۹۴۱ء میں فرمایا تھا۔

یہ تھے قائدِ اعظمؒ کے ارشادات اس باب میں کہ پاکستان کی مملکت کس قسم کی ہوگی۔ ان کی موجودگی میں یہاں ایسے بزرجمہر ہیں جو یہ خیال عام کرتے رہتے ہیں کہ تحریکِ پاکستان کے زمانے میں کسی کے ذہن تک میں نہیں تھا کہ یہاں اسلامی حکومت قائم ہوگی۔ نہ ہی اس تحریک کے قائدین کو اسلام کی ہوا تک بھی لگی تھی۔ ان حضرات کو تو اس کا علم نہیں تھا کہ قائدِ اعظمؒ نے کبھی اسلام کا نام لیا تھا یا نہیں ——— لیکن آپ کو معلوم ہے کہ اس کا علم تھا تو کسے تھا؟ اسے بھی غور سے سنئے۔ یکم نومبر ۱۹۴۱ء کو لدھیانہ میں اکھنڈ بھارت کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوا جس کی صدارت، ہندوؤں کے مشہور راہ نما مسٹر منشی (آنجہانی) نے کی۔ انہوں نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا:۔

تمہیں کچھ معلوم بھی ہے کہ پاکستان ہے کیا؟ نہیں معلوم تو سن لیجئے کہ پاکستان سے مفہوم یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ ملک کو ایک یا ایک سے زیادہ علاقوں میں اپنے لئے ایسے اماکن بنالیں جہاں زندگی اور طرزِ حکومت قرآنی اصولوں کے ڈھانچے میں ڈھل سکیں اور جہاں اُردو ان کی قومی زبان بن سکے مختلف الفاظ میں یوں سمجھئے کہ پاکستان مسلمانوں کا ایک ایسا خطۂ ارض ہوگا جہاں اسلامی حکومت قائم ہوگی۔

(ٹریبیون - ۲ نومبر ۱۹۴۱ء)

(۳) ۱۹۴۰ء میں ایک دفعہ یہ تجویز زیرِ غور آئی کہ کانگریس اور مسلم لیگ مل کر مخلوط حکومتیں قائم کرلیں۔ اس پر کانگریس کے ایک بلند پایہ لیڈر، مسٹر ستیہ مورتی نے کہا کہ:۔

کانگریس اس مسلم لیگ کے ساتھ مل کر مخلوط حکومتیں کس طرح قائم کر سکتی ہے جس کا نصب العین اسلامی حکومت کا احیاء ہو۔ (ہندوستان ٹائمز - ۱۱/۶/۴۰)

یہ بات قراردادِ لاہور کے تین ہی ماہ بعد کی ہے۔

ایک مملکت

اس مقام پر یہ بھی دیکھنے جائیے کہ قائدِ اعظمؒ نے پاکستان کے مغربی اور مشرقی بازوؤں میں دو الگ الگ آزاد ریاستوں کا تصور دیا تھا یا انہیں ایک ہی مملکت کے دو اجزائے لاینفک قرار دیا تھا۔ انہوں نے ۸؍ نومبر ۱۹۴۵ء کو ' ایسوسی ایٹڈ پریس آف امریکہ کے نمائندہ کو انٹرویو دیتے ہوئے فرمایا کہ:۔

جغرافیائی حیثیت سے، پاکستان، مغرب میں صوبہ سرحد، بلوچستان، سندھ اور پنجاب پر مشتمل ہوگا۔ اور مشرق میں بنگال اور آسام اس کا دوسرا حصہ ہوں گے۔ پاکستان کے ان اجزاء کو اس کے صوبے یا (STATES) کہہ لیجئے۔ پاکستان بہرحال ایک مسلم اسٹیٹ ہوگا۔ (تقاریر۔ جلد دوم۔ ص ۲۶-۳۲۵)

(۲) انہوں نے ۲۳؍ مئی ۱۹۴۶ء کو کیبنٹ مشن پلان کے سلسلہ میں، بیان دیتے ہوئے کہا:۔

مسلم لیگ کی پوزیشن یہ ہے کہ مشرق میں بنگال اور آسام اور مغرب میں پنجاب۔ سرحد۔ سندھ اور بلوچستان مل کر ایک آزاد، خود مختار مملکت بنیں گے۔ (تقاریر۔ جلد دوم۔ ص ۳۹)

(۳) انہوں نے ۱۴؍ دسمبر ۱۹۴۶ء کو لندن میں اعلان کیا تھا کہ "ہم ایک آزاد مملکت چاہتے ہیں" (ایضاً۔ ص ۵۰۳)۔

(۴) تشکیلِ پاکستان کے بعد، وہ اس مملکت کے گورنر جنرل بنے جو مشرقی اور مغربی دونوں حصّوں پر مشتمل تھی۔ انہوں نے ۱۹؍ فروری ۱۹۴۸ء کو باشندگانِ آسٹریلیا کے نام اپنے براڈکاسٹ میں کہا کہ:۔

پاکستان دو قطعات (BLOCKS) پر مشتمل ہے۔ ایک شمال مغرب میں واقعہ ہے اور دوسرا شمال مشرق میں۔ (تقاریر بہ حیثیت گورنر جنرل۔ ص ۵۷)

(۵) پھر انہوں نے، اسی ماہ، اہلِ امریکہ کے نام اپنے براڈکاسٹ میں فرمایا:۔

پاکستان، جو دس کروڑ مسلمانوں کے حسین خوابوں کی محسوس تعبیر ہے: ۱۴؍ اگست ۱۹۴۷ء کو وجود میں آگیا۔ یہ دنیا میں سب سے بڑی اسلامی مملکت ' اور تمام دنیا کی مملکتوں میں پانچویں درجہ پر ہے جغرافیائی اعتبار سے یہ دو حصوں میں منقسم ہے —— ایک مغربی پاکستان اور دوسرا مشرقی پاکستان۔ ان دونوں میں قریب ایک ہزار میل کا فاصلہ ہے۔ مغربی پاکستان، سرحد، مغربی پنجاب، سندھ، اور بلوچستان پر مشتمل ہے جس کا رقبہ (۱,۷۹,۰۰۰) مربع میل ہے، اور مشرقی پاکستان مشرقی بنگال اور ضلع سلہٹ پر مشتمل۔ اس کا رقبہ (۵۴,۰۰۰) مربع میل ہے۔ پاکستان کا کل رقبہ (۲,۳۳,۰۰۰) مربع میل اور آبادی قریب سات کروڑ ہے۔ (تقاریر بحیثیت گورنر جنرل۔ ص ۶۳)

فرمائیے! ان شواہد کے بعد یہ سمجھنے کے لئے کسی اور دلیل کی بھی ضرورت رہ جاتی ہے کہ قائدِ اعظمؒ کے نزدیک' پاکستان سے مراد ایک آزاد مملکت تھی، یا مشرق اور مغرب میں دو آزاد مملکتیں!

دو قومی نظریہ

اب میں عزیزانِ من! اس سوال کے تیسرے، اور بنیادی حصّہ کی طرف آتا ہوں۔ یعنی دو قومی نظریہ کی طرف۔ اس ضمن میں سب سے پہلے یہ ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ "دو قومی نظریہ" سے مراد اتنی ہی نہیں کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلمان دو قومیں بستی تھیں۔ "دو قومی نظریہ" اسلام کی بنیادی تعلیم اور ایک ابدی صداقت ہے جس کا اعلان اس دن ہوا، جب خدا کے پہلے رسول حضرت نوح علیہ نے، سب سے پہلی مرتبہ، دینِ خداوندی کو دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اس کے بعد ہر رسول اس صداقت کو دہراتا رہا۔ تاآنکہ اسے قرآن کریم کی دفتین میں ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا گیا۔ وہ ابدی صداقت یہ ہے کہ ساری دنیا کے انسان، دو گروہوں میں بٹ جاتے ہیں۔ ایک گروہ وہ جو وحیٔ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتا ہے (اور یہ وحی اب صرف قرآن مجید کے اندر محفوظ ہے) اور دوسرا گروہ وہ، جو اس نہج زندگی کو تسلیم نہیں کرتا۔ قرآن کریم کے الفاظ میں۔ هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ فَمِنكُمْ كَافِرٌ وَمِنكُم مُّؤْمِنٌ۔ (۶۴/۲)

ایک ابدی صداقت

"خدا وہ ہے جس نے تم سب انسانوں کو پیدا کیا۔ پھر تم میں سے کچھ کافر ہو گئے، اور کچھ مومن بن گئے۔" لہٰذا، قرآن کریم کی رُو سے دنیا میں قومیں دو ہی ہیں۔ ایک وہ قوم جو اس ایمان کی رو سے وجود میں آئے اور دوسری ان کی جو ان میں شامل نہ ہوں۔ اس سے واضح ہے کہ جس طرح یہ تصوّر اسلام کے خلاف ہے کہ مسلم اور غیر مسلم مل کر ایک قوم بن سکتے ہیں، اسی طرح یہ مسلک بھی یکسر خلافِ اسلام ہے کہ مسلمان رنگ، نسل، زبان۔ اور وطن کے، اختلاف سے مختلف قوموں میں بٹ سکتے ہیں۔ اور اسی سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ یہ نظریہ کسی انسانی ذہن کی تخلیق نہیں۔ یہ اس دین کا اساسی جزو ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی عطا فرمایا تھا۔ اقبالؒ نے بھی اس نظریہ کو پیش کیا تھا، تخلیق نہیں کیا تھا۔

صدرِ اول میں، اسی نظریہ کی بنا پر دو قوموں کا وجود عمل میں لایا گیا۔ — ایک امتِ مسلمہ (یعنی تمام دنیا کے مسلمان ایک قوم) اور دوسری ملّتِ کافریہ (یعنی تمام غیر مسلم، دوسری قوم) امتِ مسلمہ ایک (واحد) قوم تھی، اور اس کی مملکت بھی ایک تھی اور ضابطۂ آئین و قوانین بھی ایک۔ یعنی قرآنِ مجید — لیکن کچھ عرصہ کے بعد، جب مسلمانوں کی گاڑی اسلام کو چھوڑ کر دوسری پٹڑی پر جا پڑی تو اُمت مسلمہ (یعنی مسلمان قوم) رنگ، نسل، زبان اور وطن کے اختلاف سے الگ الگ قوموں میں بٹ گئی۔ اور ان کی مملکتیں بھی الگ الگ قائم ہو گئیں۔ اور قرآن کریم ان کا ضابطۂ حیات بھی نہ رہا۔ مسلمانوں کو اس غیر اسلامی نہج زندگی پر صدیاں گذر گئیں تاآنکہ علامہ اقبالؒ نے صدرِ اوّل کے صحیح اسلام کا تصوّر مسلمانوں کے سامنے پیش کیا، اور چاہا کہ ایک ایسا خطۂ زمین حاصل ہو جائے جس میں اس تصوّر کو عملاً متشکل کر کے

عالمگیر اُمّت اور مملکت

احیاءِ اسلام کی تحریک کا آغاز کر دیا جائے اِس تجربہ کے بعد یہ سلسلہ آگے پھیلتا جائے جس سے رفتہ رفتہ تمام دنیا کے مسلمان پھر سے امتِ واحدہ (ایک قوم) بن جائیں اور ان کی ایک مرکزی قوت قائم ہو جائے جس کا نقطۂ ماسکہ قرآن کریم ہو۔ حامد محمود صاحب نے جو کہا ہے کہ اگر دین کے اشتراک کی بنا پر قومیت کی تشکیل کا اصول صحیح ہے تو پھر پاکستان کو کسی اسلامی مملکت (مثلاً افغانستان یا ایران) کے ساتھ مدغم ہو جانا چاہیئے تو یہ بات اپنی اصل کی رو سے بالکل درست ہے۔ لیکن وہ یہ بھول گئے ہیں کہ (اوّل تو) پاکستان

کو حقیقی اسلام کی تجربہ گاہ بننے کیلئے حاصل کیا گیا تھا۔ یہ ابھی تک اسلامی مملکت نہیں بن سکا۔ اور دوسرے یہ کہ اِس وقت دنیا میں اسلامی مملکت کوئی بھی نہیں۔ سب مسلمانوں کی قومی مملکتیں ہیں۔ مسلمانوں کی مملکتیں اگر (اور جب) اسلامی بن جائیں گی تو ان کے رہنے والے مسلمان سب ایک قوم کے افراد ہوں گے اور ان مملکتوں کا ضابطۂ قوانین و سرچشمۂ آئین بھی ایک ہی (یعنی قرآن کریم) ہو گا ——— اور پھر یہ بھی ممکن ہے کہ یہ تمام مملکتیں ایک ہی مملکت میں مدغم ہو جائیں۔ موجودہ زمانے میں جب سلسلۂ مواصلات اس قدر عام اور سامانِ رسل و رسائل ایسا بافراط ہو گیا ہے، اس قسم کی عالمگیر مملکت کا قیام کچھ بھی مشکل نہیں رہا۔

یہ بہرحال بعد کی بات ہے۔ ہم نے اس تجربہ کی ابتداء کرنے کے لئے، پاکستان کی تحریک کا آغاز کیا تھا۔ اس سلسلہ میں ہمارا پہلا مطالبہ، مسلمانوں کی جداگانہ مملکت کی تشکیل نہیں بلکہ اس حقیقت کو تسلیم کرانا تھا کہ مسلمان، ایمان کے اشتراک کی بنا پر، ہندوستان کے غیر مسلموں سے الگ، مستقل بالذات، قوم ہیں ——— قائداعظمؒ سے اس کی بابت پوچھا جاتا تو وہ فرماتے کہ اگر مسلمانوں کو ایک جداگانہ قوم تسلیم کرا لیا گیا تو ان کے لئے ایک جداگانہ مملکت کا قیام اس کا منطقی اور لازمی نتیجہ ہو گا۔ اس لئے ہمیں سب سے پہلے اس بنیادی مطالبہ پر زور دینا چاہیئے۔ خود رسول اللہؐ نے بھی پہلے ایک (جداگانہ) اُمت کی تشکیل فرمائی تھی۔ مملکت اس کے پیچھے پیچھے خود آ گئی تھی۔ آیئے اب ہم دیکھیں کہ قائداعظمؒ اس مطالبہ کو کس طرح بااصرار و تکرار پیش کرتے گئے تھے۔

(۱) قائداعظم نے اس مطالبہ کا آغاز ایک ایسی حقیقت سے کیا، اور اسے ایسے انداز میں پیش کیا جو جامعیت کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے۔ انہوں نے ۸ر مارچ ۱۹۴۴ء کو مسلم یونیورسٹی میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:۔

مذہب کی بنیاد پر دو قومیں

> پاکستان کا آغاز تو اس دن ہو گیا تھا جب ہندوستان میں پہلا غیر مسلم، اسلام قبول کر کے مسلمان ہوا تھا، حالانکہ اُس وقت ہنوز مسلمانوں کی کوئی حکومت یہاں قائم نہیں ہوئی تھی۔ جونہی کوئی ہندو مسلمان ہوتا، ہندو اسے مذہباً ہی نہیں بلکہ معاشرتی، ثقافتی اور اقتصادی حیثیت سے بھی اپنی برادری سے خارج کر دیتے (اور اس طرح اس کی پہلی قومیت ختم ہو جاتی) جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے اسلام نے ان پر یہ پابندی عائد کر رکھی تھی کہ وہ کسی دوسری قومیت میں مدغم نہیں ہو سکتے۔ (اس طرح یہاں دو قومیں وجود میں آتی چلی گئیں) یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہندو اور مسلمان ایک ہی قصبہ اور ایک ہی شہر میں رہنے کے باوجود کبھی ایک قوم میں مدغم نہیں ہو سکے۔ وہ ہمیشہ دو الگ الگ قوموں کی حیثیت سے رہتے چلے آ رہے ہیں۔ (تقاریر۔ حصہ دوم۔ ص ۶۴)

(حقیقت ہے کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلمان کبھی ایک قوم میں مدغم نہیں ہوئے۔ ایک قوم میں مدغم ہونا تو ایک طرف ہندوؤں نے ہمیشہ مسلمانوں کو اچھوت سمجھا اور میں سمجھتا ہوں کہ ان کا وہ گروہ جس نے ہندوؤں میں اس خیال کو عقیدہ کی حیثیت سے ابھارا کہ مسلمان اچھوت ہیں، بڑی دور رس اور گہری سیاسی نگاہ رکھتا ہے۔ اس سے ہندو اپنا جُداگانہ تشخص قائم رکھ سکے۔) مسٹر گاندھی اس حقیقت سے اچھی طرح باخبر تھے کہ ہندو اور مسلمان نہ کبھی ایک قوم بنے ہیں، نہ بن سکتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود، وہ قائداعظمؒ کے اس مطالبہ کی مخالفت میں ایڑی چوٹی تک کا زور لگاتے رہے۔

اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ جونہی مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کو تسلیم کیا گیا، ان کا جداگانہ مملکت کا مطالبہ تسلیم کرنا، ناگزیر ہو جائے گا۔ آپ دیکھئے کہ وہ قائدِ اعظمؒ کے اس دعویٰ پر، کہ مسلمان بربنائے مذہب ایک جداگانہ قوم کے افراد ہیں، کس طرح تلملا اٹھے تھے۔ انہوں نے (مسٹر گاندھی نے) ۱۵ ستمبر ۱۹۴۵ء کو قائدِ اعظمؒ کے نام اپنے خط میں لکھا:۔

میں تاریخ میں اس کی مثال نہیں پاتا کہ کچھ لوگ جنہوں نے اپنے آباؤ اجداد کا مذہب چھوڑ کر ایک نیا مذہب قبول کر لیا ہو، وہ اور ان کی اولاد یہ دعویٰ کریں کہ وہ اپنے آباؤ اجداد سے الگ قوم بن گئے ہیں ـــــ اگر ہندوستان اسلام کی آمد سے پہلے ایک قوم تھا تو اسلام کے بعد بھی اسے ایک قوم ہی رہنا چاہیئے۔ خواہ اس کے سپوتوں میں سے ایک کثیر تعداد نے اسلام قبول کر لیا ہو۔

(۲) پاکستان کارنر ویلیوشن، مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء میں پاس ہوا۔ اس اجلاس کے خطبۂ صدارت کے دوران قائدِ اعظمؒ نے فرمایا:۔

میرے لئے یہ اندازہ لگانا بہت مشکل ہے کہ آخر ہمارے ہندو بھائی اسلام اور ہندومت کی حقیقت اور اصلیت کو سمجھنے سے کیوں گریز کرتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ یہ دونوں "مذہب" نہیں بلکہ ایک دوسرے سے مختلف معاشرتی نظام ہیں اور اس بنا پر متحدہ قومیت ایک ایسا خواب ہے جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ یاد رکھیئے! ہندو اور مسلمان زندگی کے ہر معاملہ میں جداگانہ فلسفے رکھتے ہیں۔ دونوں کی معاشرت ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ یہ دو الگ الگ تہذیبوں سے تعلق رکھتے ہیں جن کی بنیادیں، متضاد تصورات پر ہیں۔ دو ایسی قوموں کا ایک نظامِ حکومت میں جکڑ دینا باہمی مناقشت کو بڑھائے گا اور بالآخر اس نظام کو پاش پاش کر دے گا جو اس ملک کے لئے وضع کیا گیا ہو۔

(تقاریر۔ جلد اول۔ صفحہ ۷۸ - ۱۷۷)

(۳) انہوں نے ۲۷ نومبر ۱۹۴۵ء کو ایڈورڈس کالج پشاور میں تقریر کرتے ہوئے کہا:۔

ہم دونوں قوموں میں صرف مذہب کا فرق نہیں۔ ہمارا کلچر ایک دوسرے سے الگ ہے۔ ہمارا دین، ہمیں ایک ایسا ضابطۂ حیات دیتا ہے جو زندگی کے ہر شعبے میں ہماری راہ نمائی کرتا ہے۔ ہم اس ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ (تقاریر۔ جلد دوم۔ ص ۲۴۶)

(۴) انہوں نے، ۲۸ دسمبر ۱۹۴۰ء کو احمد آباد میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ:۔

ہم میں اور ہندوؤں میں کوئی بھی تو قدر مشترک نہیں۔ مذہب کو چھوڑیئے۔ ہم میں معاشرتی اور ثقافتی زندگی میں بھی کوئی اشتراک نہیں۔ (تقاریر۔ جلد اول۔ صفحہ ۲۵۴ ؛ ۲۳۹)

پھر انہوں نے پاکستان مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے اجلاس منعقدہ ۲ مارچ ۱۹۴۱ء میں اسی حقیقت کو دہرایا۔ (ایضاً)

(۵) انہوں نے ۱۴ دسمبر ۱۹۴۶ء کو لندن میں کہا کہ:۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلافات اس قدر بنیادی ہیں کہ زندگی کا کوئی مسئلہ بھی تو ایسا نہیں جس میں ہم دونوں متفق ہوں۔ (تقاریر۔ جلد دوم۔ ص ۵۰۳)

(۶) انہوں نے مسلم لیگ کے مدراس سیشن (۱۹۴۱ء) کے خطبۂ صدارت میں فرمایا:۔

مسلم لیگ کا نصب العین یہ بنیادی اصول ہے کہ ہندوستان کے مسلمان ایک جداگانہ قومیت رکھتے ہیں۔ انہیں کسی دوسری قوم میں جذب کرنے یا ان کے نظریات اور ملّی تشخص کو مٹانے کے لئے جو کوشش کی جائے اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے گا۔ . . . . . ہم نے تہیہ کر لیا ہے کہ ہم نے اپنے جداگانہ قومی تشخص اور جداگانہ مملکت کو قائم کر کے رہنا ہے۔ اس باب میں کسی کو کسی قسم کی غلط فہمی میں مبتلا نہیں رہنا چاہیئے۔ (تقاریر۔ جلد اول۔ صفحہ ۲۸۰)

(۷) اور اسی جداگانہ قومیت کے دعویٰ کی بنا پر انہوں نے جداگانہ مملکت کا مطالبہ پیش کر دیا۔ انہوں نے مسلم لیگ کے ۱۹۴۰ء

الگ قوم، الگ مملکت

کے اجلاس میں یہ کہہ کر اس کی بنیاد رکھ دی تھی کہ "مسلمان، قومیت کی ہر تعریف کی رُو سے، ایک الگ قوم ہیں اور اس لئے ان کے بسنے کی جگہ بھی الگ ہونی چاہیئے۔" (تقاریر۔ جلد اوّل۔ صفحہ ۱۸۰) پھر انہوں نے ۲ مارچ ۱۹۴۱ء کو پاکستان مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:۔

یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ ہم اقلیت نہیں بلکہ ایک قوم ہیں اور ایک قوم کے لئے لامحالہ ایک الگ علاقہ (TERRITORY) چاہیئے۔ اگر قوم کا اپنا علاقہ نہ ہو، تو اس کے قوم قوم پکارنے کا فائدہ کیا ہے۔ ایک قوم خلا میں تو نہیں رہ سکتی۔ وہ ہوا میں نہیں بلکہ زمین پر رہتی ہے اسے زمین پر حکومت کرنی چاہیئے۔ اس لئے اس کی اپنی مملکت ہونی چاہیئے۔

اور یہی ہمارا مطالبہ ہے۔ (تقاریر۔ جلد اول۔ صفحہ ۲۴۷)

اسی حقیقت کو انہوں نے یکم فروری ۱۹۴۳ء کو اسماعیلی کالج، بمبئی میں اپنی تقریر کے دوران دہرایا۔ (ایضاً۔ صفحہ ۵۱۳)

میں نے پہلے بتایا ہے کہ یہ حقیقت، کہ پاکستان کا مطالبہ اسلام کے نام پر کیا جا رہا ہے اور اس مملکت کی حکومت قرآن پر مبنی اسلامی ہوگی، مخالفین تحریکِ پاکستان مسلمانوں کی سمجھ میں تو نہیں آتی تھی لیکن ہندو اسے خوب سمجھتا تھا۔ چنانچہ اس ضمن میں، مَیں نے مسٹر نشی کے خطبۂ صدارت اور مسٹر ستیہ مورتی کے بیان کا اقتباس بھی پیش کیا ہے۔ یہی صورت "دو قومی نظریہ" کی بھی تھی۔ اسے نہ مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) سمجھتے تھے، نہ مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) لیکن اسے ہندوؤں کے لیڈر خوب سمجھتے تھے۔ لالہ لاجپت رائے، ایک کٹر ہندو لیڈر، اور نظریۂ پاکستان کا شدید ترین دشمن تھا۔

لالہ لاجپت رائے کا اعتراف

اس نے، کانگریسی راہ نما، مسٹر سی۔ آر۔ داس کو ایک خط لکھا تھا جس کا حوالہ قائدِ اعظمؒ نے مسلم لیگ سیشن ۱۹۴۰ء کے خطبۂ صدارت میں دیا تھا۔ اس خط میں لالہ لاجپت رائے نے لکھا تھا:۔

ایک اور بات جو کچھ عرصہ سے میرے لئے وجۂ اضطراب بن رہی ہے، ہندو مسلم اتحاد کا مسئلہ ہے۔ اور مَیں چاہتا ہوں کہ آپ کو اس پر دعوتِ غور و فکر دوں۔ گزشتہ چھ ماہ میں، مَیں نے اپنے وقت کا بیشتر حصّہ اسلامی تاریخ اور اسلامی قوانین کے مطالعہ میں صرف کیا ہے اور اس سے میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ یہ چیز (ہندو مسلم اتحاد) ایک امرِ محال اور ناقابلِ عمل شے ہے۔ وہ مسلمان راہ نما جو عدمِ تعاون کی تحریک میں شامل ہیں، اگر ان کے خلوصِ نیت کو تسلیم بھی کر لیا جائے، تو بھی، میرے خیال میں، ان کا مذہب اس

کے راستے میں زبردست رکاوٹ ثابت ہوگا۔

اس کے بعد انہوں نے لکھا تھا:۔

آپ کو یاد ہوگا کہ مَیں نے کلکتہ میں اپنی اس گفتگو کا، جو اس باب میں حکیم اجمل خان اور ڈاکٹر کچلو سے ہوئی تھی، آپ سے تذکرہ کیا تھا۔ ہندوستان میں حکیم صاحب سے زیادہ سلجھا ہوا کوئی مسلمان نہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا حکیم صاحب یا کوئی دوسرا مسلمان راہ نما قرآنِ کریم کے احکام پر خطِ تنسیخ کھینچ سکتا ہے..... میں تہہ دل سے ہندو مسلمان اتحاد کی ضرورت کا قائل ہوں۔ اس کے لئے میں مسلمان راہ نماؤں پر اعتماد کرنے کو بھی تیار ہوں۔ لیکن قرآن و حدیث کے احکام کو ہم کیا کریں گے۔ مسلمان راہ نما ان پر تو خطِ تنسیخ نہیں کھینچ سکتے۔ (تقاریر۔ جلد اوّل۔ ص ۱۷۴-۱۷۵)

اس کے بعد بھی، کیا اس حقیقت کے تسلیم کرنے میں کوئی شبہ رہ سکتا ہے کہ دو قومی نظریہ، جسے قائدِ اعظمؒ اس شد و مد سے پیش کرتے چلے آ رہے تھے، قرآن و حدیث کے احکام پر مبنی تھا ——— قرآن و حدیث کے ان احکام پر، جن پر، بقول لالہ لاجپت رائے، کوئی مسلمان خطِ تنسیخ نہیں کھینچ سکتا۔

تشکیلِ پاکستان کے بعد

کہا جاتا ہے کہ قائدِ اعظمؒ نے بے شک دو قومی نظریہ ہندوستان میں پیش کیا تھا۔ لیکن انہوں نے تشکیلِ پاکستان کے فوری بعد ۱۱ اور ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کی اسمبلی کی تقاریر میں کہہ دیا تھا کہ یہاں مسلم اور غیر مسلم ایک ہو کر رہیں گے اور اس طرح انہوں نے، دو قومی نظریہ پر خود ہی خطِ تنسیخ کھینچ دیا تھا! اس سلسلہ میں طلوعِ اسلام میں اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ میں اس وقت اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ اس وقت (میں سمجھتا ہوں کہ) اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ قائدِ اعظمؒ کی ان تقاریر کا مطلب ایک غیر مسلم نے کیا سمجھا تھا۔ مسٹر جوشوا فضل دین، مشہور عیسائی راہ نما ہیں[1]۔ انہوں نے ایک پمفلٹ شائع کیا تھا جس کا عنوان تھا (RATIONALE OF PAKISTAN'S CONSTITUTION)

اس میں انہوں نے، قائدِ اعظمؒ کی مذکورہ بالا تقاریر کے اقتباسات دینے کے بعد کہا تھا کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ان سے قائدِ اعظمؒ کا یہ مقصد تھا کہ یہاں نہ ہندو، ہندو رہے، نہ مسلمان مسلمان رہے، بلکہ ان کے امتزاج سے ایک متحدہ قوم متشکل ہو، جس کا نتیجہ لازماً سیکولر اندازِ حکومت ہو جائے، وہ بڑی غلطی کرتے ہیں۔ مسٹر جوشوا نے ایسے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔

یہ کہنا کہ تخلیقِ پاکستان کے بعد قائدِ اعظمؒ نے ——— جو خود پاکستان کے خالق تھے ——— اپنی پہلی تقریر میں کوئی ایسی بات کہہ دی ہے جس سے اس بات کا دور کا بھی امکان ہو کہ پاکستان کی بنیاد ہی منہدم ہو جائے گی، بالکل پاگل پن ہے۔

اور کس قدر دور رس نگاہ تھی قائدِ اعظمؒ کی؟ انہوں نے جاتے جاتے ایک بار پھر واضح کر دیا کہ اسلامی قومیت کے

---

[1] اب وفات پا چکے ہیں۔

بنیادی عناصر کیا ہوتے ہیں۔ انہوں نے ۱۹ فروری ۱۹۴۸ء کو آسٹریلیا کے باشندوں کے نام اپنے براڈ کاسٹ میں پہلے یہ فرمایا کہ:۔

مغربی پاکستان، مشرقی پاکستان سے قریب ایک ہزار میل کے فاصلہ پر ہے اور ان کے درمیان مملکتِ ہند کا علاقہ حائل ہے۔ بیرونی ممالک کے ایک طالب علم کے دل میں جو پہلا سوال ابھریگا وہ یہ ہوگا کہ (ایسی مملکت کا قیام) کس طرح ممکن ہوگا۔ ایسے دو خطوں میں، جن میں اس قدر بُعد ہو، وحدتِ حکومت کس طرح ممکن ہوگی۔ میں اس سوال کا جواب صرف ایک لفظ میں دوں گا۔ اور وہ یہ کہ:۔

ایسا، ہمارے ایمان کی رُو سے ہوگا۔ ایمان خدا پر۔ ایمان اپنے آپ پر۔ ایمان اپنے مستقبل پر۔

لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جو لوگ ہم سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں وہ ایسے مختصر سے جواب کا پورا پورا مفہوم سمجھ نہیں سکیں گے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اس اجمال کی تھوڑی سی تفصیل بھی بیان کر دوں۔

اس کے بعد انہوں نے فرمایا:۔

آخری وضاحت

پاکستان کی آبادی کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ ہم محمد رسول اللہ کی تعلیم کے پیرو ہیں۔ ہم اس اسلامی برادری کے ارکان ہیں جس میں حقوق، شرف و احترام اور تکریمِ ذات کے اعتبار سے تمام افراد برابر ہوتے ہیں۔ بنابریں ہم میں اخوت اور وحدت کا بڑا گہرا جذبہ ہے۔ ہماری اپنی تاریخ ہے اور اپنی رسوم و روایات۔ ہم اپنے نظریاتِ زندگی، نقطۂ نگاہ اور احساسِ دروں کے مالک ہیں۔ اور یہی ہیں وہ عوامل جو قومیت کی تشکیل کا مدار بنتے ہیں۔ (ان بنیادوں پر ہم ایک قوم بنتے ہیں)۔ (تقاریر بحیثیت گورنر جنرل۔ ص ۵۵)

ایمان۔ ایمان خدا پر۔ ایمان اپنے آپ پر۔ ایمان اپنے مستقبل پر۔

یہ تھی وہ اساسِ محکم جس پر مملکتِ پاکستان کی یہ رفیع و عظیم عمارت استوار ہوئی تھی۔ اور آج وہی ایمان باقی نہیں رہا۔ اور اسی کے باقی نہ رہنے سے، ایک حصہ پاکستان ختم ہو چکا ہے اور دوسرے کی بقاء کیلئے ہم دعائیں مانگ رہے ہیں۔

ہماری تباہی کے حقیقی اسباب

مشرقی پاکستان کی علیحدگی نہ تو کوئی اتفاقی یا ہنگامہ حادثہ ہے اور نہ ہی (جیسا کہ عام طور پر کہا جاتا ہے) اس کے حقیقی ذمہ دار، شیخ مجیب یا یحییٰ خاں وغیرہ ہیں۔ مجیب اور یحییٰ خاں یا ۱۹۷۱ء کے حادثات تو اس کے فوری اسباب (IMMEDIATE CAUSES) ہیں۔ اس کی ابتدا قائدِ اعظمؒ کی وفات کے فوری بعد ہو گئی تھی۔ جب (جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں،) پاکستان میں بسنے والے مسلمانوں اور غیر مسلموں کو ملا کر، اشتراکِ وطنیت کی بنا پر، ایک قوم تسلیم کر لیا گیا اور اس طرح پاکستان کے دو ستونوں میں سے ایک کو خود ہی منہدم کر دیا۔ اس وقت سندھ اور مشرقی پاکستان میں ہندو خاصی تعداد میں تھے اور اگرچہ گنتی کے اعتبار سے اقلیت میں تھے لیکن تعلیمی اور اقتصادی شعبوں میں وہ مسلمانوں پر غالب تھے، ان کے ایک قوم

تسلیم کر لینے کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ ان علاقوں پر عملاً چھا گئے۔

ازاں بعد، اردو اور بنگلہ، دونوں قومی زبانیں تسلیم کر لی گئیں اور یوں بنگالیوں کے علیحدہ تشخص کی بنیاد رکھ دی گئی۔ ہندوؤں کے زیر اثر تعلیم سے، وہاں (اور سندھ میں) سیکولر حکومت کا تصور پھیلتا چلا گیا۔ اور جب اسلام، بنائے مملکت نہ رہا تو نسل اور زبان کے اشتراک کی بنا پر، بنگالیوں میں جداگانہ قومیت کا رجحان تیز تر ہوتا گیا۔ پچیس سال سے یہ تخریبی عوامل پرورش پاتے رہے اور ارباب اقتدار میں سے کسی نے بھی نہ تو ان کے سدِّباب کی کوئی فکر کی، اور نہ ہی مثبت طور پر، اسلام کی بنیاد پر واحد قومیت کی تعمیر کے لئے کوئی عملی اقدام کیا، اگرچہ زبانی ہر ایک یہی کہتا رہا کہ اسلام ہی وہ رشتہ ہے جس کی وجہ سے ہم، اور ہزار میل دور، بنگالی مسلمان، ایک قوم کے افراد ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ زبانی دعاوی اور اعلانات خود فریبی تھا یا خدا فریبی، لیکن مجھے بہرحال غیر مؤثر۔ یہ مجھے وہ عوامل جو آہستہ آہستہ نشوونما پانے کے بعد، مشرقی بنگال کی علیحدگی کا موجب بنے — یہ اس کے بنیادی اسباب تھے، باقی سب ہنگامی اسباب۔

مشرقی پاکستان کے ہاتھوں سے چھن جانے کے بعد، اب وہی عوامل یہاں بھی تیزی سے بڑھنے شروع ہو گئے ہیں۔ اور یہ اُسی سازش کی بڑھتی ہوئی شاخ ہے جو مشرقی پاکستان کی علیحدگی پر منتج ہوئی تھی۔ اس کے لئے ہمارے پاس شواہد موجود ہیں۔ مشرقی پاکستان میں ہندو اثر کے ماتحت وہاں کے مسلمان تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ذہنی کیفیت کیا ہو چکی تھی، اس کا اندازہ ڈھاکہ یونیورسٹی کے ایم اے کے طالب علم۔ عزیز الرحمٰن کے اس خط سے لگ سکتا ہے جو اس نے ۱۹۶۹ء میں لکھا تھا اور جو طلوعِ اسلام میں شائع ہو چکا ہے۔ اس میں اس نے کہا تھا کہ پاکستان بننے کا نتیجہ تھا کہ:۔

مشرقی پاکستان کی بے باکیاں

ہم شری چیتینا، خودی رام، سبھاش بوس، بیجائے سنگھ جیسے اپنے قومی ہیروز کو فراموش کر بیٹھے تھے اور ان کی جگہ خالد رضؓ۔ طارق۔ موسےٰ اور علی رضؓ جیسوں کو اپنا ہیرو سمجھنے لگ گئے تھے۔ ہم نے اپنے دیس کے بھگوان کو بھلا دیا تھا اور اس کی جگہ ایک غیر ملکی خدا —— اللہ کو اپنا معبود تصور کر لیا تھا۔ اب ہمارا بنگالی جذبہ آہستہ آہستہ بیدار ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس سے اسلامی قومیت کے بندھن ڈھیلے پڑ جائیں گے اور علاقائی قومیت کے رشتے مضبوط ہو جائیں گے۔

اس کے بعد اس نے لکھا تھا کہ:۔

مشرقی بنگال کی اس روش کے تتبع میں، مغربی پاکستان میں ہمارے سندھی بھائی بھی بیدار ہو رہے ہیں۔ انہوں نے یہ سمجھنا سیکھ لیا ہے کہ ہم راجہ داہر کی اولاد ہیں اور پہلے سندھی اور اس کے بعد کچھ اور ہیں۔

یہ ۱۹۶۹ء کی بات ہے۔ اس کے بعد، ڈھاکہ سے شائع ہونے والے ہفتہ وار اخبار (FORUM) نے اپنی ۳۰ جنوری ۱۹۷۱ء کی اشاعت میں لکھا تھا کہ:۔

۷ دسمبر ۱۹۷۰ء تک یہ سمجھا جاتا تھا کہ اہل پاکستان میں وجہ جامعیت مذہب ہے۔ انتخابات نے اس ملمع کی قلعی کھول دی ..... اور نظریۂ پاکستان کی وہ تمام نگاہ فریب خوش نمائیاں جنہیں قدیم رجعت پسند اور استحصال پرور طبقہ اس شد و مد سے پیش کرتا تھا، افسانہ بن کر رہ گئیں۔

اس کے بعد، اس نے اپنی ۲۷ فروری ۱۹۷۱ء کی اشاعت میں لکھا تھا کہ:-

جب اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ مشرقی اور مغربی پاکستان کو متحد نہیں رکھ سکے تو پھر سوچیئے کہ بلوچ، پٹھان، پنجابیوں کو کون سا رشتہ متحد رکھ سکے گا۔ اسلام کی یاد تو یقیناً ایسا نہیں کر سکے گی۔

اب سندھ میں

یہ خیالات عام ہوئے تو (جیسا کہ عزیز الرحمٰن نے کہا تھا) ادھر سے سب سے پہلے ان کی نمود سندھ سے ہوئی۔ چنانچہ کراچی سے شائع ہونے والے روزنامہ حریّت کی ہفتہ وار اشاعت بابت ۴ نومبر ۱۹۶۸ء میں، ایک سندھی طالبہ مس نسیم مغل کا ایک خط چھپا تھا جس میں اس نے لکھا تھا۔

وہ اسلام اور پاکستان جو ہم سے ہمارا سندھ اور سندھی زبان چھینے، ایسے اسلام اور پاکستان کو ہم اپنا بدترین دشمن سمجھتے ہیں۔ یہ جھوٹ ہے کہ سندھ صرف اسلام اور اسلامی فلسفہ کی وجہ سے عظیم ہے سندھ کی عظمت، سندھ کے سادہ لوح بہادر عوام ہیں۔ سندھ موہن جو داڑو، کوٹ ڈی جان کے آثارِ قدیمہ، اور لطیف، سچل، ایاز، جی۔ ایم۔ سید کی طرح کے شاعروں، دانشوروں کی وجہ سے عظیم ہے۔ اور یہی وہ ایاز اور سید ہیں جو اسلام کے خلاف وہ کچھ لکھتے اور کہتے ہیں جو اس کے بدترین غیر مسلم دشمنوں نے بھی نہیں کہا تھا۔ اور اب یہ اس تحریک کے کارواں سالار ہیں جس کا مطمحِ نگاہ سندھ کی آزادی اور علیحدگی ہے۔

پرویز صاحب نے اس قسم کی تفصیلات پیش کرنے کے بعد کہا تھا کہ مملکتِ پاکستان کے سینے کا یہ زخم رِستے رِستے ناسور بن رہا ہے اور اگر اس کے مداوا کی طرف فوری توجہ نہ دی گئی تو یہ مہلک ثابت ہو جائے گا۔ انہوں نے کہا تھا کہ بلاتاخیر، کرنے کا کام یہ ہے کہ آئینِ پاکستان میں یہ شق رکھی جائے کہ:-

۱۔ پاکستان میں بسنے والے تمام مسلمان' اسلام کی بنیاد پر ایک قوم کے افراد ہیں۔ یہاں ایک سے زیادہ قوموں کا تصور رکھنا، اور اس کی نشر و اشاعت کرنا مملکت کے خلاف بغاوت سمجھا جائے گا۔ غیر مسلم اس قوم کے افراد قرار نہیں پا سکیں گے۔

۲۔ قرآن کریم انسانی زندگی کا واحد، مکمل اور غیر متبدل ضابطہ حیات ہے۔ یہی ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتا ہے اور مملکت کے قوانین کی اساس قرار پاتا ہے (اسے نظریۂ پاکستان کہا جاتا ہے) سپریم کورٹ کو اس کا اختیار دیا جائے کہ آئین کی کوئی شق یا مملکت کا کوئی قانون جو قرآنِ مجید کے خلاف ہو، اسے کالعدم قرار دیدے۔ افرادِ مملکت کو بھی اس مقصد کے لئے سپریم کورٹ کی طرف رجوع کرنے کا آئینی حق حاصل ہونا چاہیئے۔ اس نظریہ کے خلاف کسی تصور کی اشاعت مملکت کے خلاف بغاوت قرار دی جائے۔

۳۔ مندرجہ بالا مفاہیم کے مطابق' دو قومی نظریہ اور نظریۂ پاکستان کو نصابِ تعلیم میں لازمی مضمون کی حیثیت سے داخل کیا جائے۔ اور ملازمتوں کے لئے مقابلہ کے امتحانات میں ایک لازمی پرچہ ان موضوعات پر مشتمل ہو۔

اس علاج کی طرف کسی نے توجہ نہ دی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ قوم آج تباہی کے جہنم کے کنارے تک پہنچ گئی ہے۔ لیکن اب بھی یہ تباہی سے بچ سکتی ہے۔ بشرطیکہ مندرجہ بالا تدابیر پر فوری عمل کیا جائے۔ یاد رکھیئے! ؎

جنہیں حقیر سمجھ کر بجھا دیا تم نے
وہی چراغ جلیں گے تو روشنی ہوگی

افکارِ پرویز کی صدی

مسلسل

لیکن عین اس وقت جب وہ مردِ فرزانہ، قوم کو اس طرح جذبات کی شر انگیزیوں سے نکال کر، واقعات کی ٹھوس دنیا میں لا رہا تھا، اسلامی جماعت وجود میں آئی اور اس نے مسلمانوں کے انہی جذبات سے پھر کھیلنا شروع کر دیا جن سے وہ اتنے عرصہ سے الجھی چلی آ رہی تھی۔ جناح کی قیادت بے دینی قیادت ہے۔ یہ نماز نہیں پڑھتا۔ روزے نہیں رکھتا۔ داڑھی منڈاتا ہے۔ سوٹ پہنتا ہے، اسے مذہبی معلومات نہیں۔ وغیر ذالک۔ یہ تھے وہ "سلوگن" جن سے مسلمانوں کے جذبات کو ہوا دی گئی۔

جناحؒ کو کبھی مذہب پرستی کا دعویٰ نہیں تھا۔ اس کے حامیوں نے (بہر حال طلوعِ اسلام اپنے متعلق پورے حتم و یقین سے کہہ سکتا ہے) اسے کبھی مذہبی پیشوا نہیں مانا۔ سوال ایک سیدھا سا سامنے تھا۔ ہندوستان کے مستقبل کا فیصلہ ہو رہا ہے۔ ہندو کا مطالبہ تھا کہ پورے ملک پر اس کی اکثریت کی حکومت رہے۔ اس حکومت کے تابع، مسلمانوں کا جو حشر ہو سکتا تھا، اس کی زندہ شہادت، ہندوستان کے موجودہ مسلمانوں کی حالت ہے۔ جناحؒ کا مطالبہ تھا کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے کم از کم ان علاقوں میں تو ان کی اپنی حکومت قائم ہو جائے۔ یہ تھی جناح کی "قیادت" ذرا سوچئے کہ اس مطالبہ میں جسے جناحؒ نے پیش کیا تھا، کوئی چیز "غیر دینی" بھی تھی؟ لیکن جناحؒ یہ مطالبہ پیش کر رہا تھا اور عین اس وقت جب ہندو کی یہ انتہائی خواہش تھی کہ جناحؒ کے اس مطالبہ کے خلاف خود مسلمانوں کی طرف سے آوازیں اٹھیں۔ اسلامی جماعت تھی کہ مسلمانوں کے جذبات کو یہ کہہ کر جناحؒ کے خلاف اُبھار رہی تھی کہ اس کی قیادت غیر دینی ہے اس لئے اس کا ساتھ نہ دو۔

اب آپ سوچئے کہ اگر اس وقت ان کی آواز پر مسلمان کان دھر دیتے اور ان کے کہنے میں آکر جناحؒ کا ساتھ چھوڑ دیتے تو آج ان چھ سات کروڑ مسلمانوں کا کیا حشر ہوتا جنہیں پاکستان میں سر چھپانے کو جگہ مل گئی ہے! اور مسلمانوں کو چھوڑ دیجئے۔ خود جماعتِ اسلامی سے پوچھئے کہ اگر (خدانہ کردہ) یہ کامیاب ہو جاتے تو وہ سرزمین کہاں ہوتی جس پر یہ اسلامی

حکومت کے قیام کی دعوت دے رہے ہیں! یہ زمین جس پر آپ "مسجد" بنانے کی کوشش کر رہے ہیں اسی "غیر صالح قیادت" کی کوششوں کا نتیجہ ہے جسے ناکام کرنے کے لئے آپ اس وقت مسلمانوں کو ابھار رہے تھے! طلوعِ اسلام اس وقت پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ خدا کے لئے مسلمانوں کے جذبات کو ابھار کر انہیں غلط راہوں پر نہ لگاؤ۔ وقت بڑا نازک ہے۔ اس وقت اگر تم جناح کی داڑھی کا سوال لے کر بیٹھ گئے تو چند ہی دنوں بعد پوری کی پوری قوم کی داڑھی منڈ جائیگی۔ خود جماعتِ اسلامی کے امیر، اپنی امارت سے پہلے تمام عمر داڑھی منڈواتے رہے ہیں اگر ان کی اس زمانہ کی پیش کردہ فکر "بے دین" فکر نہ تھی تو جناح کی کوششوں کو "بے دین" قیادت کی کوشش کیوں کہتے ہو۔ خدا کے لئے حقائق کو سامنے رکھو۔ مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو ابھار کر ان کے مستقبل کو خطرہ میں مت ڈالو۔

یہ تھی اس وجۂ اختلاف، اسلامی جماعت سے طلوعِ اسلام کی۔ آپ خود سوچیئے کہ اس اختلاف میں طلوعِ اسلام کس حد تک حق بجانب تھا۔ ہمیں اس سے غرض نہیں کہ اسلامی جماعت کی اس وقت نیت کیا تھی۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ اگر انکی نیت تخریب کی تھی تو یہ غدّارِ قوم تھے اور اگر نیت اصلاح کی تھی تو ان میں سیاست سمجھنے کی ذرا بھی صلاحیت نہ تھی۔ صورتِ حال وہ تھی یا یہ، دونوں صورتوں میں نتیجہ قوم کی ہلاکت تھا۔

سنہ ۱۹۵۰ء

آئینِ پاکستان اس سال طلوعِ اسلام کا جنوری، فروری کا مشترک شمارہ شائع ہوا ہے۔ اوائل مارچ ۱۹۴۹ء میں قرار دادِ مقاصد کے پیش ہونے اور پاس ہو جانے کے بعد مولوی صاحبان نے مطالبہ کیا کہ آئین مرتب کرنے کا کام ان کے سپرد کیا جائے۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے محترم پرویز صاحب نے لکھا:۔

"قرار دادِ مقاصد کے پاس ہو جانے کے بعد اب مولوی صاحبان کے مختلف گروہوں کی طرف سے آوازیں بلند ہو رہی ہیں کہ شریعتِ حقہ کے مطابق آئین مرتب کرنا ہمارا کام ہے۔ اس فریضہ کو ہمارے سپرد کرو۔ اربابِ حکومت میں ایسے افراد موجود ہیں جو اس حقیقت کا احساس رکھتے ہیں کہ اگر آئین کی ترتیب مُلّا کے ہاتھ میں دے دی گئی تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ چنانچہ اس بنا پر حکومت عجب کشمکش کے عالم میں ہے۔ مُلّا نے عوام پر اپنا تسلط جما رکھا ہے۔ عوام کو ناراض کرنا حکومت کے لئے مشکل ہے۔ دوسری طرف آئین سازی کا کام ملّا کے ہاتھ میں دے دینا بھی خطرناک ہے، انہیں ان دو طرفہ مشکلوں سے نکلنے کی صورت دکھائی نہیں دیتی۔ لیکن

یہ مشکل کوئی ایسی مشکل نہیں جس کا حل نہ مل سکے۔ حل موجود ہے لیکن اس کے لئے ذرا جرأت درکار ہے۔ اسلامی حکومت کے نظام و آئین کی ترتیب کے لئے کسی مُلّا کی ضرورت ہی نہیں۔ اس کا سرچشمہ فقط قرآن ہے اور قرآن کوئی مشکل کتاب نہیں۔ قرآن میں آئین کے اصول دے دیئے گئے ہیں جن کی روشنی میں ہر زمانہ کے مسلمان، اپنے عہد کے تقاضوں کے مطابق، جزئیات خود متعین کر سکتے ہیں۔ ان جزئیات کے تعین کے لئے قرآن کے اصول اور عہدِ حاضر کے تقاضوں سے واقفیت درکار ہے۔ مُلّا کے پاس ان دونوں میں سے کچھ نہیں ہوتا۔ اس لئے یہ کام اس کے بس کا ہے نہیں۔ قوم کے ارباب بصیرت جو عصرِ حاضر کے تقاضوں کا علم رکھتے ہیں اگر قرآن کے اصولوں سے باخبر ہو جائیں تو صحیح اسلامی آئین نہایت آسانی سے مرتب ہو سکتا ہے۔

اس کے لئے ایک تو اس مومنانہ جرأت کی ضرورت ہے کہ یہ اعلان کر دیا جائے کہ ہمارے آئین کی بنیاد قرآن کے اصول ہوں گے اور اس کے ساتھ ہی مُلّا کی معاشی کی کوئی صورت پیدا کر دی جائے۔ مُلّا کا سارا مسئلہ معاشی ہے۔ بات بالکل واضح ہے۔ اِسے دنیا میں کوئی کام نہیں آتا جس سے وہ اپنی روٹی کما سکے۔ روٹی کے تقاضے انسان کو چین سے نہیں بیٹھنے دیتے جب تک مُلّا کی روٹی کا انتظام نہیں ہو جاتا یہ قوم کو کبھی آرام سے نہیں بیٹھنے دے گا۔ لہٰذا اس مصیبت کا حل یہی ہے کہ بیکاروں کے اس طبقہ کی روٹی کا انتظام کر دیا جائے اور آئندہ کے لئے وہ تمام راہیں بند کر دی جائیں جن سے یہ بیکار طبقہ وجود میں آ کر مستقل فتنہ کا سامان بنا رہتا ہے۔۔۔۔

فطرت کی طرف سے پاکستان کو ایک سادہ جبین عطا ہوئی تھی جس پر ہم اپنی تقدیر خود اپنے ہاتھوں سے لکھ سکتے تھے یہاں نہ ملوکیت کا استبداد پہلے سے مسلط تھا نہ پیشوائیت (THEOCRACY) کی لعنت مستولی۔ ہم یہاں منشائے خداوندی کے مطابق اسلامی نظام قائم کر سکتے تھے اس کے لئے فضا بھی سازگار تھی اور عصرِ حاضر کے تقاضے بھی مساعد۔ لیکن ہمیں ڈر یہ ہے کہ اگر اربابِ اقتدار نے، عوام پسندی کے خیال سے مرعوب ہو کر مُلّا کی اہمیت کو اسی طرح بڑھنے دیا تو یہ خطۂ زمین انسانیت ساز جنت بننے کی بجائے، انسانیت سوز جہنم بن کر رہ جائے گا۔ لہٰذا اربابِ فکر و نظر کے لئے تاریخ کا یہ دوراہا اپنے اندر بڑی نزاکت اور اہمیت رکھتا ہے۔

آیۂ رجم

ایک صاحب لکھتے ہیں۔ نومبر کے طلوعِ اسلام میں آپ نے صحیح بخاری کی ایک روایت نقل کی ہے جس میں لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا رسول اللہ کے زمانہ میں قرآن میں ایک آیت موجود تھی جس میں زانی کو سنگسار کرنے کا حکم تھا اور اس کے بعد وہ آیت قرآن میں نہیں پاتا۔ اسے پڑھ کر میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ یہ بات تو بہت دُور تک پہنچ رہی ہے۔ کیا اس موضوع پر ہماری تفسیر کی کتابوں میں کوئی بحث

ہوئی ہے؟ اسے ذرا تفصیل سے لکھئے۔ مجھے تو اس دن سے نیند نہیں آتی!

طلوعِ اسلام نے اس کا جواب دیتے ہوئے لکھا۔ اس روایت کو پڑھ کر آپ کی نیند کا اُچاٹ ہو جانا بالکل فطری امر ہے۔ ہر سعید روح پر یہی کیفیت گذریگی۔ ابھی تو آپ نے صرف ایک روایت دیکھی ہے۔ اگر آپ کہیں روایات کی ان تمام کتابوں کو دیکھ لیں تو نہ معلوم آپ پر کیا گذرے۔ اس موضوع پر ہماری کتب تفسیر میں لمبی چوڑی بحثیں موجود ہیں اور انہوں نے بڑے شدّومد سے ثابت کیا ہے کہ واقعی قرآن میں رجم کی آیت موجود تھی اور وہ اب قرآن میں نہیں ہے۔ مثلاً تفسیر ابن کثیر میں (جس کا شمار بلند پایہ تفاسیر میں کیا جاتا ہے) سورہ نور کی آیت متعلقہ زنا کے ضمن میں حسبِ ذیل تصریحات موجود ہیں۔

موطا مالک میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے ایک خطبہ میں حمد و ثناء کے بعد فرمایا کہ لوگو اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حق کے ساتھ بھیجا اور آپ پر اپنی کتاب نازل فرمائی۔ اس کتاب اللہ میں رجم کرنے کی آیت بھی تھی جسے ہم نے تلاوت کی، یاد کی اس پر عمل بھی کیا۔ خود حضورؐ کے زمانے میں بھی رجم ہوا اور ہم نے بھی آپ کے بعد رجم کیا مجھے ڈر لگتا ہے کہ کچھ زمانہ گذرنے کے بعد کوئی یہ نہ کہنے لگے کہ ہم رجم کو کتاب اللہ میں نہیں پاتے، ایسا نہ ہو کہ وہ خدا کے اس فریضے کو جسے اللہ نے اپنی کتاب میں اتارا، چھوڑ کر گمراہ ہو جائیں۔ کتاب اللہ میں رجم کا حکم مطلق حق ہے اس پر جو زنا کرے اور شادی شدہ، خواہ مرد ہو یا عورت۔ جب کہ اس کے زنا پر شرعی دلیل ہو یا حمل ہو یا اقرار ہو۔ یہ حدیث صحیحین میں بھی مذکور ہے۔ مسند احمد میں ہے کہ آپ نے اپنے خطبہ میں فرمایا لوگ کہتے ہیں کہ رجم یعنی سنگساری کا مسئلہ ہم قرآن میں نہیں پاتے۔ قرآن میں صرف کوڑے مارنے کا حکم ہے۔ یاد رکھو خود رسول اللہؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے رجم کیا اور ہم نے بھی آپ کے ساتھ رجم کیا۔ اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ لوگ کہیں گے قرآن میں جو نہ تھا عمرؓ نے لکھ دیا تو میں آیت رجم کو اسی طرح لکھ دیتا جسطرح نازل ہوئی تھی۔ یہ حدیث نسائی شریف میں بھی ہے۔ مسند احمد میں ہے کہ آپ نے اپنے خطبے میں رجم کا ذکر فرمایا رجم ضروری ہے وہ اللہ تعالیٰ کی حدود میں سے ایک ہے ..... امام ترمذیؒ بھی اسے لائے ہیں اور اسے صحیح کہا ہے۔ ابو یعلیٰ موصلی میں ہے کہ لوگ مروان کے پاس بیٹھے تھے۔ حضرت زید بن ثابت بھی تھے، آپ نے فرمایا ہم قرآن میں پڑھتے تھے کہ شادی شدہ مرد یا عورت جب زنا کاری کریں تو انہیں ضرور رجم کر دو۔ مروان نے کہا پھر تم نے اس آیت کو قرآن میں نہ لکھ لیا؟ فرمایا ستو ہم میں جب اس کا ذکر چلا تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا میں تمہاری تشفی کر دیتا ہوں ایک شخص نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اس نے آپ سے ایسا ذکر کیا اور رجم کا بیان کیا، کسی نے کہا یا رسول اللہؐ آپ رجم کی آیت لکھ لیجئے۔ آپ نے فرمایا اب تو میں اسے لکھ نہیں سکتا، یا اس کے مثل۔ یہ روایت نسائی

ہیں بھی ہے۔ پس ان سب احادیث سے ثابت ہوا کہ رجم کی آیت پہلے لکھی ہوئی تھی پھر تلاوت منسوخ ہوگئی اور حکم باقی رہا۔ واللہ اعلم ..... امام احمدؒ فرماتے ہیں پہلے اسے کوڑے مارنے چاہئیں پھر رجم کرنا چاہیئے تاکہ قرآن و حدیث دونوں پر عمل ہو جائے جیسے کہ حضرت امیرالمومنین علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ جب آپ کے پاس سراحہ لائی گئی جو شادی شدہ عورت تھی اور زناکاری میں آئی تھی تو آپ نے جمعرات کے دن کوڑے لگوائے اور جمعہ کے دن سنگسار کرا دیا۔ اور فرمایا کہ کتاب اللہ پر عمل کر کے میں نے کوڑے پٹوائے اور سنت رسول اللہ پر عمل کر کے سنگسار کرایا....

ملاحظہ فرمایا آپ نے بیان؟ آپ یقیناً حیران ہوں گے کہ وہ آیت جس میں زنا کی سزا سنگساری تھی کہاں چلی گئی اور جب آیت ہی نہیں رہی تو اس کا حکم کیسے باقی رہ گیا! لیکن اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ آپ کے ہاں یہ عقیدہ چلا آ رہا ہے کہ قرآن میں بیشتر آیات ایسی ہیں جن کی تلاوت تو کی جاتی ہے لیکن ان کا حکم منسوخ ہو چکا ہے! یہ حکم بعض دوسری آیات سے منسوخ سمجھا جاتا ہے اور بعض اوقات احادیث بھی قرآن کو منسوخ کر دیتی ہیں اور یہ عقیدہ بھی ہے کہ بعض آیات ایسی بھی ہیں کہ جو قرآن میں موجود نہیں ہیں لیکن ان کا حکم باقی ہے۔ یعنی ان کی تلاوت منسوخ ہوگئی ہے اور حکم باقی ہے!

آپ شاید ہنسیں گے کہ ہم یہ کس قسم کی باتیں لکھ رہے ہیں! لیکن ہنسیئے نہیں بلکہ روئیے اس قوم کی حالت پر جس میں ہزار برس سے یہ عقائد مسلسل چلے آ رہے ہیں اور جو شخص ان کے خلاف آواز اٹھائے اسے خارج از اسلام ٹھہرا دیا جائے۔ باقی رہا یہ کہ "بات کہاں تک پہنچ جاتی ہے" سو مولوی کو اس سے کیا غرض کہ بات کہاں تک پہنچ جاتی ہے" اس نے اشخاص کو اپنا معبود بنا رکھا ہے اسے صرف اس سے غرض ہے کہ اس کے معبود محفوظ رہیں خواہ انکی حفاظت میں۔ خدا، رسول قرآن دین، علم، عقل سب کے سب سیلاب کی نذر ہو جائیں اور ان معبودوں کی حفاظت بھی وہ ان کے لئے نہیں کرتا، بلکہ اس لئے کرتا ہے کہ انکی حفاظت میں خود اس کی حفاظت ہے وہ جانتا ہے کہ اگر مندر میں بت باقی نہ رہے تو برہمن کو کوئی نہ پوچھے گا۔

کس قدر تلخ ہیں یہ حقیقتیں لیکن انہیں بالآخر کب تک چھپایا جا سکے گا۔

تدریجی نبی

اس شمارہ میں تدریجی نبی کے عنوان سے جماعتِ اسلامی کا تجزیہ کرتے ہوئے محترم پرویز صاحب نے تحریر فرمایا:۔

گذشتہ اشاعت میں، جماعت اسلامی کے متعلق جو تصریحات شائع کی گئی تھیں ہمیں خوشی ہوئی کہ بہت سی سعید روحوں نے اس سے استفادہ کیا اور حقیقت حال منکشف ہونے پر انہوں نے اپنے مستقبل کے متعلق بھی سوچا کہ راہِ صواب کون سی ہے۔ ہم نے کہا تھا کہ جماعتِ اسلامی کے ارباب حل و عقد کے پیشِ نظر شروع ہی سے اپنی قیادت کا حصول و قیام تھا اور اس کے لئے ان کا پروگرام یکسر تخریبی تھا۔ یعنی قائد اعظمؒ کی قیادت کی مخالفت اور ان کے پیش کردہ مسلک، یعنی تحریک

پاکستان کی مخالفت۔ لیکن اس مقصد تک پہنچنے کے لئے انہوں نے وہی تکنیک اختیار کی جو اس سے پیشتر قادیانی نبوّت اختیار کر چکی تھی۔ یعنی مسلمانوں کے دردمند ریفارمر، مجدد، مہدی مثل مسیح کے بعد مقام نبوّت پر فائز ہونے کا تدریجی اسلوب کار۔ اور اس دوران میں قرآن اٹھا اٹھا کر یہ اعلانات کہ جو یہ کہتا ہے کہ ہم آگے چل کر دعوئے نبوّت کریں گے وہ ہم پر سخت اتہام لگاتا ہے بہتان تراشتا ہے۔ ہم تو مدعیٔ نبوّت کو کافر سمجھتے ہیں۔ جماعت اسلامی کے دل میں جب ہوس اقتدار نے کروٹ لی تو اس وقت مسلمان اپنی جداگانہ قومیت کے دعوے کو ہندو اور انگریز سے منوانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان حضرات نے نہایت مشفقانہ اور مصلحانہ انداز میں مسلمانوں کے اس دعوے کی تائید شروع کی اور نیشنلسٹ مسلمانوں کے خلاف اس جدوجہد میں شریک ہو گئے اور اس طرح اپنی مقبولیت بڑھانی شروع کر دی۔ چنانچہ وہ خود لکھتے ہیں۔

"جماعت کے اوائل کے دور میں جب وطنی قومیت کی تحریک مسلمانوں کو نگلنے کے لئے سرگرم عمل تھی اور خود مسلمانوں کے بہت سے لیڈر اور کارکن اپنی خدمات اس تحریک کے لئے وقف کئے ہوئے تھے تو اس نازک لمحے میں جماعتِ اسلامی نے ملّت کے سینہ میں اس فریضۂ اقامتِ دین کا احساس پیدا کرنے کی کوشش کی جو طبعی طور پر ملّت سے اپنے جداگانہ وجود کو برقرار رکھنے کا تقاضا کرتے ہیں۔

ترجمان القرآن بابت ستمبر ۱۹۴۹ء)

واضح رہے کہ ستمبر ۱۹۴۹ء کے ترجمان القرآن میں، جس سے مندرجہ بالا اقتباس لیا گیا ہے، جماعتِ اسلامی نے اپنی ان خدماتِ جلیلہ کو گنایا ہے جن کے پیشِ نظر وہ قوم سے آئندہ انتخابات میں ووٹ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ مندرجہ صدر اقتباس سے ایک ناواقف کو یقیناً یہ خیال پیدا ہوگا کہ جماعتِ اسلامی کے اوائل دور میں مسلمان عام طور پر قومیت پرستی کی تحریک میں بہے جا رہے ہیں اور یہ جماعتِ اسلامی تھی جس نے ان میں اپنے جداگانہ قومی تشخص کا احساس پیدا کیا حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے جداگانہ تشخص کا احساس علامہ اقبالؒ سنہ ۱۹۰۷ء سے پیدا کرتے چلے آ رہے تھے۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں انہوں نے الٰہ آباد کے مقام پر، اسی جداگانہ قومیت کی بنیاد پر، جداگانہ مملکت کا تصور بیدار کیا جسے ۱۹۳۸ء میں قائداعظمؒ مرحوم نے ایک مثبت سیاسی دعوے کی حیثیت سے پیش کیا۔ جماعتِ اسلامی کا نام ہی پہلی بار سنہ ۱۹۴۰ء یا سنہ ۱۹۴۱ء میں سنا گیا۔

ترجمان القرآن سے جماعتِ اسلامی کی "فرضی" خدمات کے سلسلہ میں اقتباسات پیش کرتے ہوئے محترم پرویز صاحب نے لکھا۔

یہ حصہ تلبیسِ حق و باطل اور کتمانِ حقیقت کی بڑی پُرفریب مثال پیش کرتا ہے، یہ وہ وقت تھا جب اس جماعت نے مسلمانوں کی قیادت اور ان کے دعوائے پاکستان کی مخالفت

میں ایڑھی چوٹی کا زور لگانا شروع کر دیا تھا انہوں نے شروع میں جس "جداگانہ قومیت" کی تائید کی تھی اب اسی جداگانہ قومیت کے خلاف یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ مسلمان، محض مسلمانوں کے گھروں میں پیدا ہو کر ایک الگ قوم کے دعویدار بن رہے ہیں۔ یہ جب تک پورے مسلمان نہ بن جائیں، ان کی جداگانہ قومیت کا دعویٰ ایک سیاسی ہتھکنڈہ ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمانوں کی جداگانہ قومیت اور ان کے مخالفین کی طرف سے نیشنلزم کی تحریک کی کشمکش انتہائی نازک مقام پر پہنچ چکی تھی اور فیصلے کی گھڑیاں قریب سے قریب تر آتی جا رہی تھیں۔ اس جماعت نے اس وقت اس فتنہ کا آغاز کیا تھا اور کھلے بندوں پاکستان کے مطالبہ کی مخالفت شروع کر دی تھی اس وقت "مصلحین ملت کے اس مقدس طائفہ" کا ایک ایک کارکن، جناح کو گالیاں دینے اور پاکستان کو غیر اسلامی ثابت کرنے میں مصروفِ عمل تھا۔ اگر کسی جگہ مسلمان قتل ہوتے تھے تو اس جماعت کا ردِ عمل یہ ہوتا تھا کہ ان پیدائشی مسلمانوں اور غیر مسلموں میں فرق کیا ہے۔ یہ مسلمان باقی رہیں یا نہ رہیں اس سے اسلام پر کیا اثر پڑتا ہے۔ ان کے اس وقت کے لٹریچر کو اٹھا کر دیکھئے یہ لوگ کسطرح مسلمانوں کے خلاف زہر اگلنے کے "جہادِ عظیم" میں مصروف تگ و تاز تھے۔ آج یہ لوگ ملت پر اپنے احسان جتاتے ہیں! اس میں شبہ نہیں کہ عوام کا حافظہ بہت کمزور ہوتا ہے اور انہیں تقدس کے جاذب نگاہ نقاب میں جلد فریب دیا جا سکتا ہے۔ لیکن واقعات کو کہاں تک چھپایا جا سکتا ہے۔ ہم اس جماعت کو دعوت دیتے ہیں کہ اگر ان میں اخلاقی جرأت کی کوئی رمق موجود ہے تو وہ یہ اپنے اس زمانہ کے لٹریچر کو، جب یہ مسٹر جناح کی قیادت اور مسلمانوں کے مطالبۂ حصول پاکستان کی اس طرح مخالفت کیا کرتے تھے، ذرا منظرِ عام پر لائیں اور اس کے بعد قوم سے اپنے ان "احسانات" کا بدلہ مانگیں! ان سے اس زمانہ میں کہا جاتا تھا کہ بابا! خدا کے لئے ان تیروں کو کچھ وقت کے لئے اپنے ترکش میں رہنے دو۔ ان سے ملت کا سینہ فگار مت کرو۔ مسلمانوں پر بڑا نازک وقت آ پڑا ہے۔ ہندو اور انگریز کی متحدہ قوتیں انہیں ہندوستان سے ختم کر دینے پر تلی ہوئی ہیں۔ یہاں کے مسلمانوں کی قسمت کے فیصلے، آئینی بساط پر ہو رہے ہیں انہیں ایک خطۂ زمین حاصل کر لینے دو۔ اس کے بعد آپ انہیں مسلمان بنا لینا۔ لیکن یہ ہر ایک کا مضحکہ اڑاتے اور ایسا کہنے والوں کو اسلام کا بدترین دشمن بتاتے تھے۔ آج یہ لوگ ووٹ حاصل کرنے کے لئے فرماتے ہیں کہ

ہمارے نزدیک پاکستان کے دفاع کی حیثیت وہی ہے جو اس قطعۂ زمین کی حفاظت کی ہوتی ہے جو مسجد بنانے کے لئے حاصل کیا گیا ہو۔

بعینہٖ یہی بات ان سے اس وقت کہی جاتی تھی اور یہ اس کا مذاق اڑایا کرتے تھے حقیقت یہ ہے کہ ان کے اعصاب پر جناح کی قیادت کا جن اس بری طرح سوار تھا کہ یہ جوشِ انتقام میں اندھے ہو رہے تھے اور انکی قیادت کی شکست و ریخت میں اگر ساری کی ساری قوم تباہ ہوتی

تھی تو بھی انہیں اس میں ذرا تامل نہ تھا۔ انہیں مسلمانوں کے خلاف غصہ ہی اس بات پہ تھا کہ انہوں نے انہیں چھوڑ کر جناح کو قائد کیوں بنا لیا ہے اس جرم کی پاداش ہیں، یہ لوگ مسلمانوں کو انتہائی سزا دینے پہ تلے ہوئے تھے وہ تو یوں سمجھیئے کہ یہ کچھ اللہ ہی کو منظور تھا کہ اس نے یہاں کے پانچ چھ کروڑ مسلمانوں کو محفوظ رکھ لیا ورنہ اس مقدس جماعت نے مسلمانوں کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دینے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی . . . . . .

جماعتِ اسلامی نے اپنی خدمات اسلامی کی جو تدریجی تفصیل اوپر گنائی ہے اس میں ایک کڑی باقی رہ گئی ہے جس کا ذکر ناگزیر ہے۔ یعنی جب انہوں نے اپنی بیش بہا قربانیوں سے پاکستان دلایا۔ سرحد کے ریفرنڈم میں اپنی بصیرت افروز رہنمائی سے کامیابی بھی دلا دی اور اپنی جانفروشیوں سے مہاجرین کی بحالی کا مسئلہ بھی حل کرا دیا۔ اور اس کے بعد انہوں نے دیکھا کہ ہندو کے عزائم مشؤمہ اب کشمیر کے راستے پاکستان کے لئے مستقل خطرہ بن کر سامنے آ رہے ہیں تو ان کی حمیتِ اسلامی پھر جوش میں آئی اور انہوں نے فتویٰ صادر فرما دیا کہ کشمیر کی جنگ کوئی اسلامی جنگ نہیں اس لئے اس میں سپاہیوں کی حیثیت سے شرکت جائز نہیں قرار دی جاسکتی! اور یہ فتویٰ یہ جانتے ہوئے صادر فرمایا کہ اس سے جنگِ کشمیر کو کس قدر نقصان پہنچے گا۔ چنانچہ اس باب میں خود ترجمان القرآن رقمطراز ہے کہ

> پشاور میں جب سائل نے ان سے (امیر جماعت اسلامی سے) کہا کہ میں تو اس بات (یعنی ان کے فتویٰ) کو شائع کراؤں گا تو مولانا نے ان کو اس حرکت سے باز رہنے کے لئے یہ کہا کہ اس حرکت سے تم جتنا نقصان مجھے پہنچانا چاہتے ہو۔ اس سے زیادہ نقصان تم جہادِ کشمیر کو پہنچاؤ گے۔"

ذرا غور فرمائیے حضرت امیر جماعت اسلامی کی اس "مآل اندیشی" کو، وہ یہ جانتے ہیں کہ ان کا یہ فتویٰ جہادِ کشمیر کو کس قدر نقصان پہنچائے گا (یعنی بالفاظ دیگر ہندوؤں کو کتنا فائدہ پہنچائے گا) لیکن اس کے باوجود سائل کو یہ فتویٰ دے دیتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی یہ تاکید کر دیتے ہیں کہ دیکھنا بھائی! میں نے یہ بات صرف تم ہی سے کہی ہے۔ اسے کسی دوسرے سے نہ کہنا۔ اور اس کے بعد مطمئن ہو جاتے ہیں کہ میں نے اپنا فریضۂ دین بھی ادا کر دیا اور ملت کو اس کے مہلک اثرات سے بھی بچا لیا!

قربانت شوم۔ کیا سادگی ہے۔ اللہ والوں کی باتیں ایسی ہی ہوا کرتی ہیں؟ ہم پوچھتے ہیں اربابِ جماعت اسلامی سے کہ اگر یہ فتویٰ ایسا تھا کہ اس کی اشاعت سے جہادِ کشمیر کو اس قدر نقصان پہنچنے کا خدشہ تھا تو وہ کون سی مجبوری تھی جس کے ماتحت ان کے امیر نے سائل کو اس زہر کا سراغ دے دیا؟ اور اگر مجبوری یہ تھی کہ حق بات کا چھپانا گناہ ہے تو پھر جنابِ امیر نے سائل کو اس کی تاکید کیوں کر دی کہ وہ اس حق بات کو آگے نہ پھیلائے! اگر یہ بات حق تھی تو اس کا چھپانا سائل کے لئے بھی ایسا ہی گناہ تھا جیسا مودودی صاحب کے لئے۔ اور اگر جہادِ کشمیر کو نقصان سے بچانا زیادہ ضروری تھا تو امیر

صاحب نے خود اس پر عمل کیوں نہ کیا؟.....

یہ ہے وہ خدمتِ جلیلہ جس کا ذکر ترجمان القرآن نے اپنی فہرستِ خدمات میں نہیں کیا۔ یعنی ایک اس بات کا کہ جماعتِ اسلامی نے پاکستان بننے سے پہلے، پاکستان کے خلاف کس قدر زہر اگلا۔ اور دوسرے یہ کہ جب ان کی مخالفتوں کے علی الرغم پاکستان بن گیا تو انہوں نے مسئلہ کشمیر کے راستے اس کے لئے خطرات پیدا کرنے کے لئے کیا کچھ کیا؟

یہ ہے وہ جماعت جو اپنے "سرمایۂ ایمان و اخلاق" کو لے کر الیکشن لڑنے کے لئے میدان میں آ رہی ہے! ہم حیران ہیں کہ مسلمان کس قدر سادہ لوح واقع ہوا ہے جو ایسے کھلے ہوئے حقائق کو بھی آنکھوں سے اوجھل کر دیتا ہے۔ لیکن اس میں مسلمان بیچارا کیا کرے؟ جو فتنہ تقدس کی راہوں سے کھڑا کیا جاتا ہے اس کی رو میں بڑے بڑے بہہ جاتے ہیں۔ یہ وہ جماعت ہے جو غیر صالح قیادت" کے خلاف بڑے شد و مد سے یہ الزام دہراتی رہی کہ یہ لوگ ان مناصب کے امیدوار بن کر آگے آئے ہیں، حالانکہ اسلام میں کسی ایسے شخص کو منصب نہیں دیا جا سکتا جو اس کے لئے امیدوار ہو۔ اور اس کی سند میں رسول اللہ کی یہ حدیث بڑے زور شور سے پیش کرتی رہی کہ

قال رسول اللہ انا واللہ لا نولی علیٰ ھذا العمل احدا سئلہ او احد احرص علیہ۔ (صحیح مسلم)	حضور نے فرمایا کہ بخدا یہ منصب حکومت کسی ایسے شخص کے حوالے نہیں کر سکتے جو اس کے لئے درخواست کرے یا اس کا طالب ہو

اب یہی جماعت، الیکشن میں اپنے امیدوار کھڑے کریگی اور اس کا یہ عمل نہ اسلام کے اصولِ انتخاب کے خلاف جائے گا، نہ رسول اللہ کے ارشاد گرامی کے خلاف۔ یہ ہے "صالحین کی وہ جماعت" جو انقلابِ قیادت برپا کرنے کے لئے نیزوں پر قرآن لٹکا کر میدان میں آ رہی ہے۔

طلوعِ اسلام کی نہ کوئی اپنی پارٹی ہے نہ اس کا کوئی امیدوار۔ اس لئے ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ الیکشن جیتنے کے لئے نہیں کہہ رہے۔ ہم مسلمانوں سے اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ اگر وہ تقویٰ اور تقدس" کے نعروں سے متاثر ہو کر ان لوگوں کی تائید کرنے لگ گئے تو دو باتوں میں سے ایک بات ضرور ہو کر رہے گی۔ اگر حکومت ان لوگوں کے ہاتھ میں آ گئی تو پاکستان پر پیشوائیت (THEOCRACY) کی وہ لعنت مسلط ہو جائے گی جسے اسلام مٹانے کے لئے آیا تھا، اور اگر ان لوگوں نے دیکھا کہ زمامِ اقتدار ان کے ہاتھ سے نکلے جا رہی ہے تو یہ پورے پاکستان کو تباہ کر دینے میں ذرا بھی دریغ نہیں کریں گے۔ اس لئے کہ ان کے پیشِ نظر محض اپنا ذاتی اقتدار ہے اور بس۔ نہ یہ پاکستان کے حامی ہیں نہ مسلمانوں کے ہمدرد۔ پاکستان کی حمایت اس لئے ہو رہی ہے کہ اس میں انہیں اپنے اقتدار قائم کرنے کے مواقع نظر آتے ہیں اگر انہیں یقین ہو گیا

کہ اس میں ان کا اقتدار قائم نہیں ہو سکتا تو جس طرح یہ لوگ جناح کی قیادت کی شکست وریخت میں پورا زور لگا رہے تھے اسی طرح پاکستان کی تخریب میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے۔ اللہ قوم کو ان مقدس فتنوں سے محفوظ رکھے۔

اسباب زوالِ اُمّت پیشِ نظر شمارہ میں محترم پرویز صاحب کا ایک فکر انگیز مقالہ بعنوان "اسباب زوال امت" شائع ہوا ہے جو چوّن صفحات پر مشتمل ہے اس مقالہ کے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیں:-

★ دنیا میں عزت کی زندگی، جس میں سامانِ زلیست کی فراوانی ہو اور اس کے لئے کسی بالادست قوت کا خوف دامنگیر نہ ہو، انسانیت کے شایانِ شان زندگی ہے۔ بھوک اور خوف کی زندگی خدا کا عذاب ہے

★ سامانِ زلیست تسخیرِ فطرت سے ملتا ہے جو تسخیرِ فطرت میں جدوجہد نہ کرے وہ متاعِ حیات سے محروم رہ جاتا ہے۔

★ فطرت کے ذخائر ہر اس شخص اور قوم کے ہاتھ آسکتے ہیں جو ان کے لئے جدوجہد کرے اس میں مومن وکافر کی کوئی تمیز نہیں۔

★ "دنیا" کے لفظی معنی ہیں قریبی اور "آخرت" کے معنی ہیں بعد میں آنے والا۔ قرآن کریم ان پیش پا افتادہ قریبی مفاد عاجلہ کو "دنیا" سے تعبیر کرتا ہے اور مستقبل کا نام آخرت رکھتا ہے۔

★ قرآن کہتا ہے کہ دنیا میں دو قسم کے انسان ہوتے ہیں (انسان یا انسانوں کے گروہ، اقوام) ایک وہ جو ہمیشہ پیش پا افتادہ قریبی مفاد (IMMEDIATE GAIN) کے پیچھے لپکتے ہیں۔ ان کی تمام حد تک تگ وتاز مفادِ عاجلہ کے لئے ہوتی ہے۔ ان کے سامنے صرف اپنا آپ ہوتا ہے۔ انہیں اس کی فکر نہیں ہوتی کہ آنے والی نسلوں پر کیا گزرے گی۔ ان کی ساری جدوجہد "حال" کے لئے ہوتی ہے "مستقبل" کی انہیں کچھ فکر نہیں ہوتی۔ قرآن ان پیش پا افتادہ، قریبی مفادِ عاجلہ کو "دنیا" سے تعبیر کرتا ہے۔ اور مستقبل کا نام آخرت رکھتا ہے۔ لہٰذا اس کے نزدیک "متاعِ دنیا" سے مفہوم ہوتا ہے وہ مفاد جو انسان صرف اپنی ذات کے لئے تلاش کرتا ہے اور "سامانِ آخرت" سے مقصود ہوتا ہے وہ متاع جسے وہ آنیوالی نسلوں کے لئے تیار کرتا ہے۔

★ تاریخ کے قدیم ایام میں، مذہب کو اپنی سپیہ کاریوں اور ابلہ فریبیوں کے لئے زیادہ کاوش نہیں کرنی پڑتی تھی۔ دین کے صحائف (جو حضرات انبیاء کرام کی وساطت سے انسانوں کو ملتے تھے) محفوظ نہیں رہتے تھے اس لئے اربابِ مذہب کے لئے یہ آسان تھا کہ جو کچھ جی میں آیا اسے "کتاب اللہ" کہہ کر سنا دیا ..... لیکن اسلام کے معاملہ میں صورت مختلف تھی۔ یہاں دین کا ضابطہ (قرآن) اپنی اصل شکل میں موجود تھا اور اس کی حفاظت

کا ذمہ خود خدا نے لے رکھا تھا اس لئے اب مذہب کو اپنی فسوں کاریوں کے لئے کاوش کرنی پڑی اب کامیابی کی صورت یہی ہو سکتی تھی کہ دین کے ضابطہ (قرآن) کے الفاظ اور اس نظام کے ارکان کو تو علیٰ حالہٖ قائم رکھا جائے لیکن ان کے مقصود و مفہوم کو یکسر بدل دیا جائے

★ دین اپنی دعوت کی شہادت کے لئے اپنے ٹھوس، تعمیری، نتائج پیش کرتا تھا اس لئے اسکی دعوت یکسر علیٰ وجہ البصیرت تھی (ادعوا الی اللہ علیٰ بصیرۃ انا ومن اتبعنی) لیکن یہی بصیرت مذہب کی دشمن تھی۔ اس لئے مذہب نے یہ عقیدہ پیدا کیا کہ مذہبی معاملات میں عقل کو کچھ دخل نہیں۔ مذہب کی دنیا شعور و ادراک کی حدوں سے ماوراء ہے۔ لہٰذا جو کچھ تم سے کہا جاتا ہے۔ سوچے سمجھے بغیر اس پر عمل کئے جاؤ۔ مذہب نے اپنے اولین مخاطب گروہ سے یہ کہا اور اس کے بعد آنے والی نسلوں سے یہ کہ تم صرف یہ دیکھو کہ تمہارے اسلاف کی روش کیا تھی۔ تم آنکھیں بند کر کے ان کی تقلید کئے جاؤ یہی راہ صواب ہے یہی جنت کا سیدھا راستہ ہے۔

★ ہر رسول کا پیغام تقلید کی مخالفت ہوتا تھا اور اسی بناء پر ان کی سخت مخالفت ہوتی تھی، وہ انہیں علم و دانش (یعنی دین) کی طرف دعوت دیتے تھے۔ ان کی قوم مسلکِ اسلاف کی تقلید کو حسن کارانہ شیوۂ زندگی ٹھہراتی تھی۔ لیکن خدا کے رسول اس قوم کو اس مسلک کے خلاف جھنجھوڑتے تھے اور قوم اتنی ہی سختی سے اس کی مخالفت کرتی تھی۔

★ تنفر اور علم و عقل سے دشمنی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کائنات کی ہر شئے قابلِ نفرت بن جاتی ہے چنانچہ مذہب پرست لوگوں کی نگاہ میں کائنات کے ہر گوشے میں شر ہی شر دکھائی دیتا ہے۔ انہیں ہر شئے سے کراہت پیدا ہو جاتی ہے۔ ہر تبسم فشاں چہرہ، انہیں موت کا آئینہ دار اور ہر گلفشاں پیشانی انہیں جہنم کا کندہ دکھائی دیتی ہے۔ ادب، موسیقی، آرٹ، سائنس زیبائش کے شگفتہ اسباب و ذرائع ان کے مذہب میں حرام ہوتے ہیں۔

★ جس طرح ملوکیت کے استبداد میں منافقانہ زندگی، خوشامد کا رنگ اختیار کر لیتی ہے اسی طرح مذہب کی دنیا میں منافقانہ زندگی بھی خوشامدانہ مسلک اختیار کر لیتی ہے۔ اس میں خدا کا تصور۔ ایک جابر و مستبد بادشاہ کا سا قائم ہو جاتا ہے۔ جس سے انسان ڈرتا ہے خوف کھاتا ہے۔ اس لئے اسے خوش رکھنے کے لئے اس کی پرستش کرتا ہے اس کے حضور چڑھاوے چڑھاتا ہے (مذہب میں نماز، روزہ، صدقہ، خیرات اسی خوشامدانہ مسلک کے مظاہر بن جاتے ہیں) اور اس طرح انسان خدا کو خوش کر لیتا ہے۔ اب رہیں مذہب کی غیر فطری پابندیاں، انہیں توڑنے کے لئے اس کا جی للچاتا ہے۔ لیکن مذہبی زندگی کا تقدس اسے اعلانیہ ایسا کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اس لئے اس کے لئے وہ فریب کارانہ راہیں تلاش کرتا اور بہانے تراشتا ہے۔ وہ حسنِ فطرت سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کیف اندوز

نہیں ہوتا۔ کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھتا ہے۔ وہ موسیقی کو حرام قرار دیتا ہے لیکن منرا میر کے بغیر سن لینے میں کوئی باک نہیں سمجھتا۔ آرٹ اس کے نزدیک سخت قابلِ نفرت شے ہے لیکن "ہاف ٹون تصویر" اتروا لینے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتا۔ حُسن اور اس کی نیرنگیوں کا تصور تک بھی اس کے نزدیک جہنم میں پہنچا دینے کے لئے کافی ہوتا ہے لیکن وہ ایک "معشوقِ حقیقی" کی فریب انگیز اصطلاح میں حسن کی شعبدہ کاریوں اور بادۂ گلفام کی کیف باریوں کے سرور اور تذکرے جھوم جھوم کر سنتا ہے اور اس طرح ذہنی تعیش سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ ماہرینِ نفسیات، نفسیاتی تجارب کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اس قسم کے غیر فطری دباؤ (REPRESSION) سے جنسی بدنہادی (SEX-PERVERSION) پیدا ہو جاتی ہے جس کے مظاہرے بڑے گھناؤنے ہوتے ہیں۔ اسی جنسی بدنہادی کا نتیجہ ہے کہ غیر عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھنے کے مدعی دھڑا دھڑ شادیاں کئے چلے جاتے ہیں اور بے حد و شمار لونڈیوں سے تمتع کرنا عین "شریعتِ حقہ" کے مطابق قرار دیتے ہیں۔

★ یہ ہیں اسبابِ زوالِ امت "اسباب" محض تفصیل کے اعتبار سے۔ ورنہ درحقیقت مسبب صرف ایک ہے اور وہ ہے مذہب۔ دنیا میں آج تک کسی مذہب پرست قوم نے ترقی نہیں کی۔ نظر دوڑا کر دیکھئے یہ حقیقت ہر طرف بکھری دکھائی دے گی۔ جس قدر کوئی قوم زیادہ مذہب پرست ہے اسی قدر وہ دنیاوی ترقیوں میں پست و زبوں حال ہے۔

★ بات صرف اتنی ہے کہ مسلمانوں کو مذہب چھوڑنا ہوگا۔ مذہب چھوڑنے کے بعد ان کے سامنے دو راستے ہوں گے یا تو یہ بھی دنیا کی قوموں کی طرح اپنا مقصود و مدعا فقط قریبی مفاد (دنیا) قرار دے لیں۔ اس کے حصول میں پھر کوئی جھجک (SCRUPLES) ان کے عناں گیر نہیں ہوں گی۔ اس کے بعد جو حشر اقوامِ عالم کا ہوگا وہی ان کا ہو جائے گا۔

اور دوسرا راستہ یہ کہ مذہب کو چھوڑ کر "دین" کو اختیار کر لیا جائے۔ اس میں قریبی مفاد بھی اس انداز کے ہوں گے کہ دنیا کی دوسری قومیں اس پر رشک کریں گی۔ اور اس کے بعد مستقبل بھی ایسا روشن اور تابناک ہوگا کہ واشرقت الارض بنور ربّھا: (زمین اپنے نشوونما دینے والے خدا کے نور سے جگمگا اٹھی) کا درخشندہ منظر سامنے آجائے گا۔

پروازِ پرویزؒ

نصف صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں! پروازِ پرویزؒ کا احاطہ کرنے کے لئے عمرِ خضر بھی شاید اپنے ناکافی ہونے کا گلہ کرے۔ پرویزؒ کی پرواز کا تعاقب چند مقالوں، کتابوں، مضامین اور صفحات کو کالا کرنے سے نہیں کیا جا سکتا۔ اس پرواز کی رفتار کے آگے روشنی کی رفتار بھی ماند پڑ گئی ہے جو ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ کا دعویٰ کرتی ہے۔ اُس قلم کے بال و پر جل جائیں گے جس نے پرویزؒ کی پرواز کا پیچھا کیا۔ اور پھر رہ رہ کر مجھ سا ناتواں اور کمزور لاعلم و جاہل انسان تو یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ پرویزؒ کون تھا؟ کیا تھا؟ کیسا تھا؟ کب تھا؟ اور کب تک، حیاتِ جاوید بنا رہے گا۔

۲۴ فروری ۱۹۸۶ء کو اس وقت جب آپ یہ مقالہ سن رہے ہیں بحرِ قرآن کا یہ غوطہ زن ٹھیک آج کے دن ایک سال قبل اسی وقت اپنا رختِ سفر مشتمل بر مفہوم القرآن، مطالب القرآن معارف القرآن، لغات القرآن، تبویب القرآن، کتاب التقدیر، معراج انسانیت اور شاہکار رسالت لے کر مستعار زندگی سے حیاتِ ابدی کی طرف جا رہا تھا۔ اسے یہ غم ہی نہ تھا کہ وہ اپنی پیاری بیٹی طاہرہ اور بیٹے سلیم کو سوگوار چھوڑے جا رہا تھا۔ یاد رہے یہ مرحوم کی روحانی اولاد ہے اسلئے کہ ان کا غم غلط کرنے کے لئے وہ نسخہ ہائے کیمیا بنام طاہرہ و سلیم چھوڑے جا رہا تھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ فردوسِ بریں پر پرویزؒ کھڑا ہے۔ دستک دی۔ آواز آئی۔ کون؟ بھرائی ہوئی آواز میں انتہائی متانت سے جواب دیا۔ بارگاہ رسالت کا ایک غلام، موسوم بہ غلام احمد المعروف پرویزؒ حاضر آیا ہے۔ سوال ہوا۔ اپنے ساتھ امت کی طرف سے یا حکومتِ وقت کی طرف سے کوئی خطاب یا کوئی تمغہ لے کر آئے ہو۔ جواب دیا۔ ایک اور صرف ایک خطاب ملا ہے۔ پھر آواز آئی۔ غلام احمد پرویزؒ! کیا تم وہی ہو جس نے احادیث نبوی کو ہمیشہ سچے موتی کہا۔ کیا تم وہی پرویزؒ ہو جس نے رسولؐ عربی کا نام لینے سے پہلے دہن کو مشک و عنبر سے دھویا؟ کیا تم وہی پرویزؒ ہو جس نے قرآن کو قرآن ہی میں تلاش کیا؟

کیا تم وہی پرویزؒ ہو جس نے قرآن کریم کو جہّال کی بجائے خواندہ لوگوں میں متعارف کرانے پر زور دیا؟ کیا تم وہی پرویزؒ ہو جس نے احبار اور رہبان کا ترجمہ پیشوایانِ شریعت اور

پیرانِ طریقت کیا؟ کیا تم وہی پرویز ہو جس نے رسولِ عربی کو معراجِ انسانیت کے خطاب سے نوازا؟

اور اس کے خلیفہ ثانی کو شاہکارِ رسالت کہا؟

کیا تم وہی پرویز ہو جس نے زندگی کے پچاس سال قرآن کی بے پناہ سچائیوں کو قرآن ہی کے آئینہ میں دکھایا؟ کیا تم وہی پرویز ہو جس نے مذہبی لبادے اوڑھے ہوئے مذہب کے نام کا غلط استعمال کرنے والوں کو ہر لمحہ بے نقاب کیا؟ کیا تم وہی پرویز ہو جس نے دین اور مذہب کا فرق بتایا؟

کیا تم وہی پرویز ہو جس نے انسانیت کی مشکلات کا حل قرآن کریم سے نکالا؟

کیا تم وہی پرویز ہو جس نے قرآن کے معاشی نظام اور نظامِ ربوبیت کو متعارف کرایا؟

کیا تم وہی پرویز ہو جس نے ہمیشہ اپنے آپ کو قرآن کریم کا ادنیٰ طالب علم کہا؟

کیا تم وہی پرویز ہو جس نے کہا کہ قرآنِ کریم گنڈوں۔ تعویذوں۔ بوسے لینے اور دینے، نیز فالناموں کی کتاب نہیں بلکہ ضابطۂ حیات ہے؟

کیا تم وہی پرویز ہو جس نے کہا کہ قرآن کریم کو عملی طور پر نافذ کیا جا سکتا ہے، صرف تلاوت کے حصے کا ثواب کوئی معنی نہیں رکھتا؟

کیا تم وہی پرویز ہو جس نے کہا کہ قرآن قصے اور کہانیوں کی کتاب نہیں بلکہ اس کا ہر ایک لفظ اپنے اندر معانی کا بحرِ ذخار رکھتا ہے؟

کیا تم وہی پرویز ہو جس نے رب کا ترجمہ نشوونما کرنے والا کر کے نظامِ ربوبیت کا علمبردار قرآن کریم کو کہا؟ کیا تم وہی پرویز ہو کہ جس نے انسانیت کی مایوسی کو حرام سمجھا اور تکریمِ انسانیت کے داعی رہے ہو؟

کیا تم وہی پرویز ہو جس نے قرآنی معاشی نظام کی ترویج کے لئے ایک علیحدہ خطۂ زمین کے حصول میں محمد علی جناحؒ اور اقبالؒ کی قلم نوائی کی اور ان لوگوں کو ہمیشہ بے نقاب کیا جنہوں نے حصولِ پاکستان کی مخالفت میں ایک لمحہ فروگذاشت نہ کیا اور بعد میں اس کے حصول کے داعی بن بیٹھے؟

کیا تم وہی پرویز ہو جس نے ببانگِ دہل کہا کہ سچ کی سیاست سے ہی حصولِ مقاصد کی تکمیل ہوتی ہے اور جہاں مصلحت آمیز دروغ گوئی ہو وہاں مقاصد کے حصول میں دوری واقع ہو جاتی ہے؟

کیا تم وہی پرویز ہو جس نے رکاوٹوں اور مخالفتوں کا ڈٹ کر تنہا مقابلہ کیا اور کسی مقام پہ بھی پائے استقلال میں جنبش تک نہ آئی؟

کیا تم وہی پرویز ہو جسے اقبالؒ کا مردِ قلندر کہتے ہیں؟

کیا تم وہی پرویزؒ ہو جس کا مقصود حیات کائناتِ قرآن کی خلانوردی رہا ؟
کیا تم وہی پرویزؒ ہو جس کا اوڑھنا بچھونا، کھانا، پینا، نشست وبرخاست وبہ غرض مادی زندگی کا ہر لمحہ آئینۂ قرآن میں نظر آتا رہا ؟
کیا تم وہی پرویزؒ ہو جو کہتا رہا کہ انسان انسان کا محکوم نہیں ہو سکتا بلکہ حاکمیّت صرف اور صرف اللہ کی ذات کو حاصل ہے۔ انسان اس حاکمیّت کا ایک ذریعہ ہے ؟
کیا تم وہی پرویزؒ ہو جس نے معاشرہ کی تشکیل میں عورت کو اس کے قرآنی حق سے روشناس کرایا اور کیا تم وہی پرویزؒ ہو جس نے محمد عربیؐ کے بعد کسی بھی شکل میں چور دروازے سے آنے والے نام نہاد نبی اور اس کے پیروکاروں کو سب سے پہلے غیر مسلم قرار دینے کی تجویز پیش کی ؟

جواب دیا، اے فخرِ موجودات تیری بارگاہ کا ایک غلام اپنے کشکول میں ان تمام سوالات کا جواب تیری امّت کی طرف سے عطا کردہ خطاب "منکرِ حدیث" کو لے کر آیا ہے

فردوسِ بریں کا در کشا ہوا۔ پرویزؒ خراماں خراماں، پُر تبسّم لبوں کے ساتھ۔ چہرے پر متانت، بہشتِ نعیم کے اس حصّے کی طرف چل پڑا جس کا وعدہ ہوا تھا کہ

أُولٰئِكَ جَزَاؤُهُمْ مَغْفِرَةٌ مِنْ رَبِّهِمْ وَجَنّٰتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَنِعْمَ أَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ۝ ۴ ع

وہاں اعمالِ صالحہ کا حساب چکایا جا چکا تھا اور یہاں اہلِ لاہور اُن کے جسدِ خاکی کی تدفین کی تیاری میں مصروف تھے۔ اسی رات خاکسار کو ۱۰ بجے گرفتار کر لیا گیا اور اس طرح جنازہ کی سعادت سے محروم ہوا۔ کتنا رویا اس کی شہادت روزِ حشر میری اولاد ہی دے سکتی ہے۔

تاریخ انسانیّت اس روح فرسا حقیقت پر گواہ ہے کہ انسان نے انسان کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑنے کے لئے تین عوامل سے کام لیا۔ یہ غلامی اپنی تفصیل کے لحاظ سے نہ صرف جسمانی طور پر بلکہ روحانی طور پر قبول کی گئی ہے۔ یہ تین عوامل اگرچہ وقت کے ساتھ ساتھ ان کی شاخوں میں اضافہ ہوتا رہا ہے۔ لیکن بہر رنگ ان کا منبع یہی عوامل رہے ہیں۔ جن میں سے سب سے پہلا جاگیرداری نظام۔ دوسرا سرمایہ داری اور تیسرا مذہبی پیشوائیت رہا ہے۔ پہلے دو نظاموں نے تو ہامان اور فرعون کی شکل اختیار کر کے تکریم انسانیت کی وہ دھجیاں اڑائیں کہ آج تک دونوں کے نام ضرب المثل بن چکے ہیں۔ پرویزؒ نے قرآن مجید ہی سے ان دونوں کو ایسا بے نقاب کیا ہے کہ فرعون یا ہامان کا وہ تصور جو مذہبی پیشوائیت پیش کرتی رہی ذہن قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ ان تینوں عوامل کا کچھ ایسا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے کہ موخرالذکر صرف اپنے آپ کو دماغی کاوشوں اور اختراعات تک محدود رکھ کر اول الذکر وثانی الذکر سے اپنے پیٹ کی آگ بجھانے کا کام لیتا رہا ہے اور دونوں نظاموں کو بچانے کے لئے ڈھال کا کام کرتا رہا ہے۔ آج

کے مادی دور میں چند نظاموں نے بھی اپنی حیثیت کو منوا لیا ہے لیکن دراصل مذکورہ نظاموں ہی کی جائز یا ناجائز اولاد ہے۔ پرویزؒ نے ہادیٔ برحق کو ایک انقلاب آفریں اور ان تینوں نظاموں پر ضرب کاری لگانے والا انسانِ فرقان کہہ کر اُس انقلاب کی نشاندہی کی ہے جس کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم رحمت اللعالمین بن کر تشریف لائے۔ کافۃ الناس کی آمد کی بنیادی غرض قرآن مجید سے واضح کی۔ کہ وہ ذات انسانیت کو ظلمات سے نکالنے کے لئے آئی تھی نہ کہ انسانیت کو انسان کی بنائی ہوئی زنجیروں میں جکڑنے کے لئے آئی تھی۔ مکہ معظمہ جو کرّہ ارض پر پہلا بیت اللہ ہے اور اسی نسبت سے "وضع للناس" ہے کے مقام پر حضورؐ کی آمد بے معنی نہیں۔ پرویزؒ نے اسی نسبت سے فخرِ موجودات کو "معراجِ انسانیت" کہا۔ اور اس کے لائے ہوئے نظام سے ہی یہ دکھلایا کہ "کاش یہ لایا ہوا نظام بجائے ذہنی عیاشی کے دکھانے کے عملی شکل میں نافذ کر دیا جائے تو بنی نوع انسان کی فلاح کا ضامن ہوگا۔ اس لئے کہ قرآن مجید ایک غیر متنازعہ کتابِ الٰہی ہے۔ جس پر کم از کم ایمان کی حد تک عالمِ اسلام اور حقیقت کی حد تک دیگر اقوام متفق ہیں۔ لیکن دُکھ اس بات کا ہے کہ کہتا ہر ایک ہے کہ یہ ایک مکمل ضابطہ حیات ہے مگر اس کو عملی شکل میں لانے کی جب بات کی جائے تو تان "دعا" پر جا کر ٹوٹتا ہے۔ کہ دعا کیجئے خدا ہمیں قرآن شریف پر عمل کرنے کی توفیق عطا کرے۔ آپ سب باآواز بلند کہیں۔ آمین۔

پرویزؒ پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ "دعا" کا قائل نہیں۔ کسی نے یہ نہ پوچھا کہ واقعی وہ دعا کا قائل نہ تھا۔ وہ سراپا دعا تھا لیکن عمل کے ساتھ دعا کا قائل تھا۔ وہ اس دعا کا ہرگز قائل نہ تھا جس میں عمل کا دخل نہ ہو۔ جس میں قول اور فعل کی یکسانیت نہ ہو

پرویزؒ نے قرآنی آئینِ مملکت کے دو بنیادی نکات کی نشاندہی کی ہے۔ میں ان ہی کے الفاظ پر اکتفا کروں گا۔

۱۔ قرآنِ کریم انسانی زندگی کے اہم مسائل کے متعلق اصولی رہنمائی دیتا ہے۔ ان کی جزئیات متعین نہیں کرتا۔ یوں سمجھئے کہ وہ ایسی حدود مقرر کرتا ہے جن کے اندر رہتے ہوئے امّت مسلمہ اپنے اپنے زمانوں کے تقاضوں کے مطابق جزئی تفصیلات خود مرتب کرتی ہے۔ یہ اصول یا حدود غیر متبدّل ہوتے ہیں۔ اور ان کی بنیادوں پر مرتب کردہ جزئیات میں عند الضرورت ترمیم و تنسیخ اور حک و اضافہ ہو سکتا ہے۔"

۲۔ قرآن مجید کاروانِ ملّت کے لئے ایک منتہیٰ مقرر کرتا ہے۔ اس کے سامنے ایک نصب العین رکھتا ہے۔ جس تک آہستہ آہستہ بتدریج پہنچا جا سکتا ہے۔ حضور نبی اکرمؐ نے ایک ایسی امّت کی تشکیل فرمائی جو قرآنی نصب العین پر دل کی گہرائیوں سے یقین رکھتی اور اُس تک پہنچنا اپنا مقصودِ حیات سمجھتی تھی۔ ہماری حالت اس سے مختلف ہے۔ ہم نام تو وہی رکھتے ہیں جو اس وقت کا تھا لیکن ہمارا ایمان ان کا سا ایمان نہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم کو خدا کی

کتاب کہتے ہوئے بھی ہمارا عمل اس کے مطابق نہیں۔ بنابریں ہمارے لئے کشاد کی راہ یہی ہوگی کہ قرآن کے مقرر کردہ منتہیٰ مدوّن کرنے کی مجاز ہوگی۔ مملکت میں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں ہو سکے گا جو قرآن کریم کے خلاف ہو۔"

قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا (۱۰/۱۹) تمام نوع انسان شروع میں امّتِ واحدہ کی طرح تھے پھر انہوں نے باہمی اختلاف پیدا کر لئے۔ یہ اختلافات رنگ، نسل، خون، زبان اور وطن کے اختلافات سے لے کر ایک دوسرے کی مسجدوں میں نہ جانا، ایک دوسرے کا جنازہ نہ پڑھنا، مسلمان کا مسلمان کے ہاتھوں ہلاک یا شہید ہونے تک پہ مبنی ہیں اور تھے۔ ان اختلافات کو مٹانے کے لئے خدا نے انبیاء کرام کو بھیجنا شروع کیا۔ جنہوں نے فرمایا وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ ۲/۲۱۳ - اور ان کے ساتھ کتاب نازل کی تاکہ وہ لوگوں میں ان باتوں کا فیصلہ کرے جن میں وہ اختلافات کرتے تھے۔ چنانچہ پرویزؒ نے ان اختلافات کی بنیادوں کو تلاش کیا اور خداوند کریم کا دیا ہوا پیغام یاد دلایا۔ کہ انسانوں کے باہمی اختلافات مٹانے کا ذریعہ خدا کی کتاب ہوتی ہے یعنی وحی خداوندی۔ جو لوگ اس وحی کو ضابطہ حیات تسلیم کرتے تھے وہ رنگ، نسل، خون، زبان یا وطن کے اختلاف کو قائم رکھنے کی وجہ سے دوسری قوم کے افراد قرار پاتے تھے۔ اس معیار کے مطابق تمام نوع انسانی اصولی طور پر دو گروہوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ - (۶۴/۲) اللہ وہ ہے جس نے تمام انسانوں کو پیدا کیا سو تم میں سے ایک گروہ ان کا ہے جنہیں کافر کہا جاتا ہے اور دوسرا گروہ جو مومن کہلاتے ہیں۔ لیکن مذہبی پیشوائیت نے پرویزؒ کو اس خطاب سے بھی نوازا۔ پرویزؒ نے مملکت کے آئین کی جو وضاحت کی ہے وہ اتنی مکمل اور محیط ہے کہ اس کو عملی شکل میں نافذ کرنے کے لئے کسی بھی مشکل کے پیش آنے کی امید نہیں ہو سکتی۔ اور اس طرح پرویزؒ وہ پہلا مفکر ہے جس نے دین اور مذہب میں نمایاں فرق بتایا۔ جس کے نزدیک دین ضابطہ حیات کا نام ہے جب کہ مذہب چند پوجا پاٹ کے ادا کرنے کا نام ہے۔ دین اطاعتِ خداوندی اور وحی الٰہی ہے، لیکن دوسری طرف مذہب انسان کے پیدا کردہ اور نافذ کردہ عوامل کی ایک شکل ہے۔ دینِ انسانیت کی فلاح کا نام ہے لیکن مذہب غلامی کی زنجیروں میں جکڑ بندی کی ایک شکل ہے۔ پرویزؒ کے نزدیک دین کائنات کے سربستہ رازوں کو طشت از بام کرنے کا ایک ذریعہ ہے جب کہ مذہب ان رازوں پہ دبیز پردے ڈالنے کی کوشش ہے۔ چنانچہ قرآن کا انقلابی تصوّر یہ ہے کہ اس نے کہا کہ ہر انسان، انسان ہونے کی جہت سے یکساں واجب التکریم ہے۔ اس لئے یہ چیز شرفِ انسانیت کے منافی ہے کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم ہو۔ پرویزؒ نے قرآن کریم سے ہی قرآن کریم کی تشریح کی۔ اس آیت کو اسلامی آئین کی اساس بنایا کہ مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ

کُوْنُوْا عِبَادًا لِّیْ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ .... (۳/۷۹) کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں، خواہ اسے ضابطۂ قوانین۔ اختیار حکمرانی حتیٰ کہ نبوت بھی کیوں نہ حاصل ہو کہ وہ دوسرے انسانوں سے کہے کہ تم اللہ کے نہیں میرے محکوم بن جاؤ۔ پرویزؒ نے تھیاکریسی، ملوکیت، سیکولرازم، نظریۂ میثاق، ڈیماکریسی، مغربی ہو یا نام نہاد اسلامی، اور شہنشاہیت غرض کسی بھی نوعیت کی حکمرانی کو قرآن کی رُو سے غلط ثابت کیا اور انسانیت کے لئے نامکمل۔ پرویزؒ نے اسی نسبت سے قانون کی وضاحت کرتے ہوئے کہا ایک ایسی قوم میں جس میں وحدتِ عقائد نہ ہو جمہوریت اس سے زیادہ اور کیا کر سکتی ہے کہ وہ اکثریت کے مفاد کی نمائندگی کرے اور اقلیت کو مغلوب رکھے۔ ہم یا تو خدا کے بندے بن سکتے ہیں یا انسان کے وہ ایک انسان ہو یا زیادہ بات ایک ہی ہے۔ اگر انسانوں کے اوپر کوئی اقتدارِ اعلیٰ نہ ہو تو پھر کون سی چیز ایسی رہ جاتی ہے جو ہمیں طاقتور افراد کے تغلب سے محفوظ رکھ سکے۔ وہ صرف اور صرف وحیٔ خداوندی ہے۔ پرویزؒ کا مطالعہ کرنے سے آپ اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ پرویزؒ کے ہاں وقتی مصلحت، حالات کا تقاضا، موقعہ شناسی اور مختلف اوقات پر مختلف آوازیں نکالنا۔ قسم کی چیزیں نہیں ملیں گی۔ جس کی سب سے بڑی وجہ پرویزؒ کی قرآن بینی ہے۔

پرویزؒ خود بھی شخصیت پرستی کا مخالف رہا ہے اور وہ اسے شرک سے تعبیر کرتا ہے۔ انسانی ذات کو اعلیٰ مقاصد کے حصول کا ایک ذریعہ سمجھتا ہے۔ پرویزؒ کے ہاں قوموں کی تعمیر فکر سے ہوتی ہے۔ نہ ہنگاموں سے نہ تعزیرات سے، جس کے متعلق اقبالؒ نے بھی کہا تھا ؎

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

پرویزؒ کی پچاس سالہ عرق ریزی کا صلہ مذہبی پیشوائیت نے اگر اسے دیا تو کچھ ایسا دیا کہ پرویزؒ اور منکرِ رسالت دو حقیقتوں کا ایک نام قرار پایا۔ آج کسی کو بھی آپ پرویزؒ کا نام لے کر دیکھیں تو معاً اس کے منہ سے یہ بات نکلے گی کہ وہ پرویزؒ جو منکرِ حدیث ہے۔ حالانکہ اس کی ساری زندگی احادیث کے سچے موتیوں کے پرونے میں گزر گئی۔ ان موتیوں کی بنی ہوئی اپنے ہاتھ کی مالا پرویزؒ زیبِ سینہ کئے بارگاہِ ایزدی میں پہنچا۔ کسی نے بھی یہ تکلیف گوارہ نہ کی، حتیٰ کہ ملک کا پڑھا لکھا طبقہ بھی مذہبی پیشوائیت کی ایسی گرفت میں آیا ہوا ہے کہ اپنے آپ کو بے بس پا رہا ہے۔ بس جس سے بھی پوچھیں تو جواب ملتا ہے کہ یار در اصل نمازِ جنازہ سے ڈرتے ہیں ایسا نہ ہو کہ مُردہ خوار ہو جائے اور جگ ہنسائی ہو۔ کیا پرویزؒ کے جنازہ میں شریک ہزاروں سوگوار پرویزی ہی تھے۔ مرحوم کو خداوند کریم جنت الفردوس میں مقام دے۔

خدا رحمت کند ایں بندگانِ پاک طینت را۔

(احقر عبداللہ ثانی)

حقائق و عبر

۱۔ شریعت بل کو واقعی شرعی بنایا جائے:

پچھلے سال کے آخر میں علماء کے ایک گروپ کی جانب سے سینٹ میں شریعت بل پیش کیا گیا تھا، جس کے بارے میں یہ دعوےٰ کیا گیا تھا کہ یہ مسلمانانِ پاکستان کا متفقہ مطالبہ ہے۔ اور اس سے پاکستان صحیح معنوں میں اسلامی مملکت بن جائیگا۔ بریلوی اور شیعہ فرقوں کی جانب سے اس بل کی سخت مخالفت کی جا چکی ہے۔ ایک تیسرا مذہبی فرقہ یعنی جماعتِ اہلحدیث، اس کے بارے میں کیا کہتی ہے، یہ ان ہی کی زبانی سنیئے:۔ جسے اس جماعت کے ہفت روزہ ترجمانِ اہلحدیث نے اپنی ۹ مئی کی اشاعت میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے:۔

مرکزی جمعیتِ اہلحدیث پنجاب کے امیر مولانا محمد سلیمان انصاری اور مولانا محمد اشرف سلیم نے ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ تفرقہ پسند علماء کو حکومت ہی ایک پلیٹ فارم پر جمع کر سکتی ہے، تاکہ اسلام کے نفاذ کا عمل تیز کیا جا سکے۔ انہوں نے کہا کہ شریعت بل میں ترمیم کی ضرورت ہے، کیونکہ حنفی علماء نے اس میں بہت سی الجھنیں پیدا کر کے مسلمانوں کو آپس میں لڑانے کی کوشش کی ہے، حالانکہ شریعت کا مقصد معاشرہ کو واقعی اسلامی بنانا ہے۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ موجودہ شریعت بل سینٹ سے واپس لے کر اسے علماء کی ایک کمیٹی کے ذریعے نئے سرے سے تیار کیا جائے۔ (ہفت روزہ اہلحدیث لاہور بابت ۹ مئی ۱۹۸۶ء)

۲۔ علماء کے ایک دوسرے کیخلاف فتاوی:

جمعیتِ علماء اسلام، اپنے لیڈر جناب مفتی محمود صاحب کی وفات کے بعد، دو دھڑوں میں تقسیم ہو چکی ہے۔ پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام کی دعویدار، اس جماعت کے دونوں دھڑے آج کل ایک دوسرے پر جو کیچڑ اچھال رہے ہیں تو اس سے بددل ہو کر، ان کے ایک مقتدر لیڈر مولانا میاں سراج احمد دین پوری، نے اپنی جماعت کو چھوڑ کر ایک الیسی پارٹی میں شرکت کر لی ہے جس

کے بارے میں بعض علماء نے کفر کا فتویٰ دے رکھا ہے۔ جب مولانا دین پوری سے ان کے اس اہم فیصلے کے محرکات کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا :۔

" اب دوسرے محرک کا ذکر کروں گا۔ جو منفی ہے اور جس نے مجھے اس بڑھاپے میں جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے اور وہ ہے علماء اور مذہبی رہنماؤں کا مخالفانہ بلکہ معاندانہ اور حد درجہ تعصب پر مبنی رویہ جس کی کم از کم مجھے توقع نہ تھی۔ جب ہماری جماعت (جمعیت علماء اسلام) میں انتشار پیدا ہوا تو میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس میں میرا کوئی دخل عمل نہیں تھا۔ جب مجھے امیر بنایا گیا تو میرے فرشتوں کو بھی اس فیصلے کا گمان نہیں تھا۔ البتہ جو کچھ بھی ہوا بہر حال وہ ناخوشگوار تھا لیکن اگر ایسا ہو گیا تھا تو یہ ادھڑے ٹانکے دوبارہ سینے کا اہتمام کرنا چاہیئے تھا لیکن بڑے بڑے مذہبی رہنماؤں نے وہ زبان استعمال کی اور مجھے دشنام طرازی کا نشانہ بنایا کہ الامان والحفیظ اور دکھ تو یہ ہے کہ وہ لوگ پیش پیش تھے جو ہماری ہی خانقاہ کے فیض یافتہ اور میرے بزرگوں سے روحانی نسبت رکھتے ہیں۔ مجھے کافر، مرتد، واجب القتل اور نہ جانے مسجدوں، محرابوں اور منبروں پر کیا کچھ قرار نہیں دیا گیا۔ میں نے سوچا کہ ایسی زبان تو وہ بھی استعمال نہ کرتے جنہیں ہمارے مسلک سے اختلاف ہے اور ہماری سیاست سے اختلاف ہے یہ اپنے ہیں تو دشمن کون ہوں گے" ؟

(بحوالہ ہفت روزہ استقلال لاہور بابت ۱۸ تا ۲۷ مئی ۱۹۸۶ء صـ۱۱)

۳۔ علماء اور ان کی سیاست :

اپنے اسی انٹرویو میں انہوں نے علماء کی سیاست کے بارے میں فرمایا :۔

" مذہبی جماعتیں تو اگرچہ ان میں بڑے خاندانی اور موروثی سیاستدان نہیں ہیں تاہم مجھے ان کے مذہبی بنیادوں پر فرقہ وارانہ سیاسی اختلاف سے ہمیشہ الرجی رہی اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر ملک توڑنے کا کوئی تیر بہدف نسخہ ہے تو وہ یہی ہے کہ بعض جماعتوں کو نہ ہی فرقہ واریت کی بنیاد پر سیاست کی اجازت دے دی جائے اگر ایسا ہوا (جیسا کہ اب ہو رہا ہے) تو ملک کو ختم کرنے کے لئے باہر کی فوجوں کی ضرورت نہیں۔ یہی نام نہاد دیندار ہی اس کی تباہی کے لئے کافی ہیں اور صدر ضیاء الحق نے ان لوگوں کو زکوٰۃ اور دیگر ذرائع سے اس مقام پر پہنچا دیا ہے کہ یہ بے چارے نہ ضیاء کو چھوڑ سکتے ہیں اور نہ اب عوام میں کام کر سکتے ہیں"۔

۴۔ قومی اتحاد کے کروڑوں روپے کے فنڈ !

۱۹۷۷ء میں اس وقت کی حکومت کے خلاف، قومی اتحاد کے نام سے ایک تحریک شروع کی گئی تھی، جس میں جماعت اسلامی سمیت ملک کی تمام مذہبی جماعتیں بھی شریک تھیں۔ ان میں سے ایک جماعت خاکسار تحریک کے سربراہ جناب خان محمد اشرف خان نے ابھی حال ہی میں، قومی اتحاد کے

بارے میں، ہفت روزہ چٹان کو ایک تفصیلی انٹرویو دیا ہے۔ جو اس اخبار کے یکم فروری کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ اس انٹرویو میں ان سے قومی اتحاد کے کروڑوں روپے کے فنڈ کی بابت پوچھا گیا، تو انہوں نے فرمایا:۔

پاکستان قومی اتحاد کے فنڈز کا بتانا کہ یہ کتنا تھا بہت مشکل ہے۔ کیونکہ پاکستان قومی اتحاد کے مرکزی خزانچی عبدالحمید بٹ صاحب تھے جن کا تعلق جمعیت علماء اسلام سے تھا۔ اب وفات پا چکے ہیں۔ جہاں تک مجھے علم ہے، جتنے فنڈز جمع ہوتے تھے۔ وہ ساتھ ہی ساتھ خرچ ہوتے رہتے تھے وہ ایک دیانتدار اور مخلص شخصیت تھے۔ جب تحریکِ نظامِ مصطفیٰ کے دنوں میں عوامی مظاہرے ہو رہے تھے۔ تحریک کے ساتھ عملی تعاون کے علاوہ مسلمانوں نے بے پناہ فنڈز بھی قومی اتحاد کو دیئے تھے۔ ہو سکتا ہے یہ فنڈز کروڑوں تک بھی پہنچ گئے ہوں۔ ان فنڈز کے استعمال کی یہ صورت تھی کہ ہر جماعت اپنے طور پہ فنڈز اکٹھے کر رہی تھی۔ جن سیاسی جماعتوں کے دفاتر شہروں میں ہوتے تھے۔ لوگ قومی اتحاد کی تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے ہزاروں روپے جمع کرواتے تھے اور بعد میں وہ سیاسی جماعتیں قومی اتحاد کے مرکزی کیشیئر کے پاس جمع کروانے کی پابند تھیں۔ مگر اس وقت دیکھنے میں آیا کہ جس بڑی تعداد میں جماعت کے دفاتر میں فنڈز جمع ہوئے وہ صحیح طور پر مرکزی کیشیئر کے پاس جمع نہ کروائے گئے تھے۔ ان جماعتوں سے استفسار پہ یہ جواب ملا کہ وہ فنڈز دراصل قومی اتحاد کو نہیں بلکہ ان کی جماعت کو ہی دیئے گئے تھے۔ اس سلسلے میں ایک لاکھ ۴۰ ہزار روپے کی خطیر رقم ایک شخص قومی اتحاد کے دفتر میں لایا۔ اس وقت مرکزی دفتر میں کوئی بھی شخصیت موجود نہ تھی۔ اس شخص کو کہا گیا کہ وہ یہ رقم ملک وزیر علی صاحب کے پاس جمع کروا دے جو ان کے پاس جمع کروا دی گئی، مگر بار بار مطالبات کے باوجود قومی اتحاد کے مرکزی فنڈز میں واپس جمع نہیں کرائی گئی۔ کئی دفعہ کی لیت ولعل کے بعد تحریکِ استقلال کے صدر ائر مارشل اصغر خاں نے یہ فرمایا کہ وہ رقم قومی اتحاد کے لئے نہیں تھی بلکہ تحریکِ استقلال کو دی گئی تھی۔ اس طرح مختلف سیاسی جماعتوں نے عوام کی طرف سے دیئے گئے عطیات کو مرکزی دفتر میں جمع نہ کروایا کہ یہ عطیات صرف ان کی اپنی جماعت کے لئے تھے اس کے علاوہ ایک فنڈ اس تحریک نظام مصطفیٰ کے شہداء اور زخمیوں کے لئے اکٹھا کیا گیا۔ اس کمیٹی کے سربراہ جسٹس بدیع الزمان کیکاؤس صاحب مقرر تھے۔ اس فنڈ میں ۲۰، ۲۵ لاکھ روپے کے قریب رقم اکٹھی ہوئی جج صاحب اور انکے مقرر کردہ ذمہ دار افراد نے مستحق لوگوں میں تقسیم کی۔ اس میں سے ۹ لاکھ روپے کے قریب رقم بچ گئی۔ لیکن جب اس رقم کی ان سے واپسی کا مطالبہ کیا تو جسٹس بدیع الزمان کیکاؤس نے فرمایا کہ وہ رقم قومی اتحاد کی ضروریات کے لئے نہیں بلکہ تحریک کے متاثرین شہداء اور زخمیوں کے لئے جمع کی گئی تھی۔ لہٰذا وہ اس رقم کی کسی اور ضرورت کے لئے استعمال کی اجازت نہیں دیں گے اور قومی اتحاد کو یہ رقم ہرگز واپس نہیں دی جا سکتی۔

(ہفت روزہ چٹان لاہور بابت یکم مئی ۱۹۸۶ء، صفحات ۲۰، ۲۲)

۵۔ شیطان اور تبلیغ :

بریلوی فرقہ کی دینی یونیورسٹی جامعہ نظامیہ رضویہ کے ایک استاد جناب صدیق ہزاروی صاحب حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کی تعلیمات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

تبلیغ اچھی چیز ہے لیکن ضروری نہیں کہ ہر مبلغ راہ راست کی دے رہا ہو یا وہ خود راہِ راست پر ہو اس لئے مبلغ کو پرکھنا لازمی ہے کہ کہیں شیطان انسانی لباس میں فریضہ تبلیغ تو نہیں انجام دے رہا۔ اس سلسلے میں حضرت شیخ علیہ الرحمہ کا ارشاد گرامی ملاحظہ ہو۔ حضرت شیخ علی خباز رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ رات کو جب میں اپنی آرام گاہ میں تھا تو یکایک دیوار شق ہوگئی۔ اور اس میں سے ایک مکروہ شخص نمودار ہوا اور جب میں نے اس سے پوچھا کہ تم کون ہو؟ اس نے کہا "میں ابلیس ہوں اور تجھے نصیحت کرنے آیا ہوں"۔

میں نے پوچھا "کیا نصیحت کرنا چاہتے ہو"؟ اس نے جواب دیا۔ "میں تجھے مراقبہ میں بیٹھنے کا طریقہ سکھانا چاہتا ہوں"۔ پھر وہ سرین کے بل بیٹھ گیا۔ پنڈلیوں کو ہاتھوں سے گھیرا ڈال لیا اور سر گھٹنوں پر رکھ کر "یہ نشست مراقبہ ہے"۔ فرماتے ہیں پھر میں نے بوقت صبح یہ واقعہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ سے بیان کرنا چاہا تو آپ نے میرے کچھ کہے بغیر مصافحہ کے لئے ہاتھ پکڑ کر فرمایا "اے عمر! شیطان نے تم سے جو کچھ کہا وہ سچ تھا لیکن بذاتِ خود وہ بہت جھوٹا ہے اس لئے آئندہ تم اس کی بات تسلیم نہ کرنا" (۱۰۷)

(بحوالہ ماہنامہ الجامعۃ، جامعہ محمدی شریف جھنگ بابت اپریل مئی سنہ ۱۹۸۶ء صـ ۲۷)

شاہ جیلان کی اس تعلیم سے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ ہمارے صوفیاء کے ہاں مروجہ نشست مراقبہ کا طریقہ شیطان کا بتایا ہوا ہے۔ اسے بزرگوں نے تسلیم کر لیا تھا لیکن آئندہ کے لئے تنبیہ کر دی تھی کہ شیطان کا بتایا ہوا کوئی دوسرا طریقہ تسلیم نہ کیا جائے۔ بالعجب

۶۔ انسان کے خلیفہ ہونے کا تقاضا :

مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کسی زمانے میں جماعت اسلامی کے سرکردہ لیڈر تھے۔ اس وقت ان کے بارے میں خود جماعت کی جانب سے یہ پروپیگنڈہ کیا جاتا تھا، کہ قرآن فہمی میں ان کا مرتبہ، مودودی صاحب سے بھی بلند ہے۔ چنانچہ ان کی تفسیر تدبر القرآن، مودودی صاحب کی تفسیر، تفہیم القرآن پر ترجیح دی جاتی تھی۔ آج کل ان کے اہم تفسیری نکات، ان کے ماہنامے، تدبر، میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اس ماہنامے کی اپریل ۸۶ء کی اشاعت میں ان کا ایک تفسیری نقطہ ملاحظہ ہو۔

انسان کو اللہ تعالیٰ نے عقل، ادراک اور علم کی جن صلاحیتوں سے آراستہ فرمایا ہے اور جن فطری

قوتوں اور صلاحیتوں سے ان کو مسلح کیا ہے، انکی روشنی میں یہ حقیقت واضح فرمائی ہے کہ انسان زمین کے دوسرے جانداروں کی طرح اس زمین ہی کی مخلوق نہیں ہے بلکہ اس کا مرتبہ بہت بلند ہے اور خدا نے اسکو خلیفہ کا منصب عطا کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو ذات خود ہر جگہ حاضر و ناظر ہو، جو ہر قسم کے تصرف پر خود پوری پوری قدرت رکھتی ہو، جو کسی کی مدد و اعانت کی محتاج نہ ہو۔ جس کو ایک پل کے لئے بھی اپنی مملکت کے امور و معاملات سے دستکش یا غیر حاضر ہونے کی ضرورت پیش نہ آتی ہو، اس کی طرف سے کسی کو خلیفہ بنانے کے معنی اس کے سوا کچھ ہو ہی نہیں سکتے کہ وہ اپنے خلیفہ کو کچھ اختیارات دے کر یہ امتحان کرنا چاہتی ہے کہ یہ ان اختیارات کو کس طرح استعمال کرتا ہے۔ خلیفہ کے مطلق العنان اور غیر مسئول ہونے کا تصوّر بنیادی طور پر غلط ہے۔ کوئی صاحب قدرت اور علیم و خبیر اپنے خلیفہ کو شتر بے مہار بنا کر نہیں چھوڑ سکتا۔ وہ لازماً اس کی ایک ایک خیانت پر اس سے مواخذہ بھی کرے گا اور اگر اس نے اپنے فرائض صحیح طور پر انجام دیئے ہوں گے تو اس کو اس کی خدمات کا بھرپور صلہ بھی دے گا۔ گویا جزا و سزا انسان کے مرتبۂ خلافت پر سرفرازی کا ایک لازمی اور بدیہی تقاضا ہے۔

(ماہنامہ تدبّر بابت اپریل ۱۹۸۶ء صہ ۳۱)

جیسے مولانا امین احسن اصلاحی صاحب ایک اہم تفسیری نقطے کے طور پر بیان کر رہے ہیں، امت مسلمہ کے تمام علماء کے نزدیک ایسا عقیدہ سخت گناہ ہے یہاں تک کہ وہ ایسا عقیدہ رکھنے والے کو فاسق و فاجر قرار دیتے ہیں۔ علامہ الماوردی اپنی کتاب الاحکام السلطانیہ میں لکھتے ہیں :۔

وَامْتَنَعَ جمهور العلماء مِن جواز ذالك ونَسَبُوا قائلهُ إلى الفجور

(الاحکام السلطانیہ عربی ایڈیشن دار الکتب العلمیۃ بیروت صہ ۱۵)

(ترجمہ) جمہور علماء نے اس عقیدے کو ناجائز کہا ہے اور ایسا عقیدہ رکھنے والے کو فاسق و فاجر قرار دیا ہے۔

امام ابن تیمیہ نے اپنے فتاویٰ الکبریٰ کی جلد دوم کے صفحہ ۵۵۳ پر اسے خالص شرک قرار دیا ہے۔ اور اردو زبان میں مولانا سعید اکبر آبادی نے بھی تفصیلات اپنی کتاب صدیق اکبر کے صفحہ ۸۹، ۹۰ پر درج کی ہیں۔ ان کی یہ کتاب انجمن حمایت اسلام لاہور کی جانب سے شائع کی گئی ہے۔

۷۔ <u>حدیث کے نادان محافظ</u>!

فرقہ اہلحدیث اپنے آپ کو حدیث کا محافظ قرار دیتا ہے لیکن اس کے علماء

ایسی عجیب عجیب حرکات کرتے ہیں، جو حدیث کے تمام مجموعوں کو مشکوک بنا دیتی ہیں۔
طلوع اسلام نے اس فرقے کے ترجمان ہفت روزہ اہلحدیث میں شائع ہونے والے غلط ورود کی طرف ان کی توجہ دلائی۔ تو ان کے ایک علامہ حافظ ابو محمد عبدالقادر حماد صاحب نے مشہور نحوی سیبویہ کے حوالے سے ایک شعر نقل کر کے ثابت کیا تھا کہ مروجہ درود کی عبارت میں آلہ کا اضافہ نہ صرف یہ کہ عربی گرائمر کے مطابق جائز ہے بلکہ یہ اضافے والا درود زیادہ صحیح ہے۔

ہم نے انہیں اسی مشہور نحوی سیبویہ کے حوالے سے بتایا تھا کہ اس نے اس اضافے کو نہ صرف یہ کہ ناجائز قرار دیا تھا بلکہ ایک فعلِ قبیح قرار دیا تھا۔ تاہم اس فیصلے کے ساتھ، انہوں نے یہ تصریح کر دی تھی، کہ شعری ضرورتوں کی وجہ سے شعر میں اس کا استعمال جائز ہے۔ سیبویہ نے اپنا یہ فیصلہ اس شعر کے اوپر والی سطر میں دیا تھا۔ جسے اہلحدیث کے علامہ صاحب نے اپنے مسلک کی تائید میں پیش کیا تھا۔ لیکن بد دیانتی ملاحظہ ہو کہ انہوں نے اپنے غلط مسلک کو ثابت کرنے کے لئے شعر کو تو نقل کر دیا، لیکن ان کے اصل فیصلے کا ذکر تک نہ کیا۔

انہوں نے اپنی اس بد دیانتی کی وضاحت کرنے کی بجائے ہفت روزہ اہلحدیث کی ۲ مئی ۱۹۸۶ء کی اشاعت میں فرمایا ہے کہ ہم نے اس غلط درود کے بارے میں کوئی فتویٰ نہیں دیا تھا بلکہ صرف یہ کہا تھا کہ یہ آلہ کے اضافے والا درود ہی زیادہ مناسب ہے۔ پہلے غالباً انہوں نے زیادہ صحیح کے الفاظ استعمال کئے تھے،

ہم نے انہیں بتایا تھا کہ حدیث کے ۷۰ مجموعوں میں جو ایک لاکھ سے زیادہ مرتبہ درود شریف لکھا گیا ہے۔ وہ تو وہی ہے جو عام مسلمانوں میں مروج ہے۔ اب اہلحدیث کی جدید تحقیق کے مطابق یہ درود غیر مناسب قرار پاتا ہے۔ تو اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ جن جامعینِ حدیث کو صحیح اور مناسب درود کا علم ہی نہیں تھا، تو نہ معلوم انہوں نے احادیث کے متن میں کیا کیا غلطیاں کی ہوں۔ پہلے ہم نے یہ بات اشارہ میں کہی تھی۔ لیکن اب جو اہلحدیث حضرات اپنی غلطی پر اصرار کر رہے ہیں، تو اس نکتہ کو ذرا تفصیل سے ان کی خدمت میں پیش کر دیا ہے۔ کیا وہ اپنی ضد کی وجہ سے حدیث کے سینتالیس مجموعوں کی صحت کو مشکوک تو نہیں بنا رہے۔